دولت آصفیہ

اور

حکومت برطانیہ

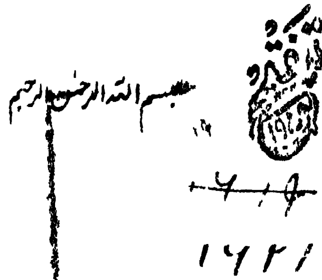
سیاسی تعلقات کی تاریخ پر ایک نظر

از

ابوالاعلیٰ مودودی

جید برقی پریس دہلی

قیمت ۸ر



سر جان ملکم کے بقول "دولت آصفیہ پوری برٹش انڈین امپائر کا مرکز ثقل ہے"
سلطنت کے اندر ایک سلطنت جو تقریباً ۱۳ ملین انسانوں پر حکمران ہو جس کے حدود
کی وسعت یورپ کی جلیل القدر سلطنتوں کے برابر ہو جسکو اپنی رعایا پر کامل حاکمیت
مطلقہ حاصل ہو ایسی حقیقت نہیں ہے کہ اس کی اہمیت کو آسانی کیساتھ نظر انداز کیا جاسکے۔ ایک
ایسی طاقتور سلطنت نے کس طرح برطانوی حمایت (Protection) کو قبول
کرلیا اور اپنی اس آزادی اور اندرونی استقلال کو اپنے مساوی الدرجہ بلکہ بہ اعتبار
جغرافیائی وسعت کے بہت کم کے دینے پر راضی ہوگئی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو قدرتی طور پر
پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح ڈیڑھ صدی سے زیادہ کے حلیفانہ تعلقات میں دونوں سلطنتوں
کے درمیان کس قسم کے تعلقات رہے ہیں؟ اور دونوں نے ایک دوسرے کی دوستی
کا حق کیسے ادا کیا ہے؟ یہ بھی اہم اور ضروری سوالات ہیں جہاں تک "دولت آصفیہ"
کا تعلق ہے تاریخ برطانیہ کی دوستی و وفاداری کے واقعات کے باب موجود ہیں میسور
کی لڑائیوں سے لیکر جنگ سلطنت عثمانیہ تک کوئی ایسا نازک موقع نہیں آیا جس میں
منجملہ ہی تلوار دولت آصفیہ نے اس کی مدد نہ کی ہو۔ اسکا اعتراف خود برطانوی مدبرین نے
نہایت کھلے دل سے کیا ہے لیکن اس کے مقابلہ میں سلطنت برطانیہ نے اپنے "یار وفادار"

کو دوستی کا کیا بدلہ دیا؟ اس کا جواب اکثر سکوت سے دیا گیا ہے۔ تاریخ اپنے سینہ میں معلومات کا ایک وافر ذخیرہ رکھتی ہے مگر اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی۔

دکن کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلو خاص طور پر دلچسپ ہے۔ میں ایک عرصہ سے ارادہ کر رہا تھا کہ اس پر ایک مفصل کتاب لکھوں۔ چنانچہ اس کے لئے کافی مواد فراہم کر لیا تھا لیکن حالات نے اس ارادہ کو پورا کرنے کی مہلت نہ دی۔ اب ایک خاص موقع پر اخبار "الجمعیۃ" کے لئے اس موضوع پر ایک مختصر مضمون لکھنے بیٹھا۔ تو تمام پچھلی معلومات کا ہجوم ہو گیا۔ اور اجمال واختصار کی انتہائی کوشش کرنے کے باوجود دامن بحث و بیان کسی طرح نہ سمٹ سکا۔ آخر مجبوراً اس مضمون کو اس چھوٹے سے رسالہ کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ یہی رسالہ ایک کتاب کی صورت اختیار کرے گا۔

ابوالاعلیٰ مودودی

۲۷ اکتوبر ۱۹۲۸ء

فہرست مضامین

انگریزی تعلقات کی ابتدا

سلطنت آصفیہ سے انگریزی تعلقات کی ابتدا حضرت مغفرت مآب آصف جاہ اول ہی کے عہد میں ہوچکی تھی گرچہ یہ تعلقات دو دوستوں کے سے نہ تھے بلکہ ایک فریادی اور ایک فریاد رس کے سے تھے۔ اول اول انگریز اپنی تجارت کی حفاظت و ترقی کے لئے اس سلطنت کے ماتحت عہدہ داروں سے ملکر کام لے لیا کرتے تھے۔ مگر جب ۱۷۴۶ء میں فرانسیسیوں نے انگریزوں سے مدراس چھین لیا، اور کرناٹک کے صوبیدار گورنر انورالدین خاں نے انگریزوں کی مدد نہ کی، تو فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے گورنر نے نواب آصفجاہ سے فریاد کی۔ نواب نے اس فریاد کو توجہ کیساتھ سُنا۔ اور انورالدین خاں کو حکم دیا کہ فرانسیسیوں نے انگریزوں سے جو کچھ چھین لیا ہے وہ انگریزوں کو واپس دلوادیں۔

اس واقعہ کے ایک سال بعد نواب آصفجاہ کا انتقال ہوگیا۔ ان کی جگہ ان کے دوسرے لڑکے ناصر جنگ مسند نشین ہوئے۔ مگر مظفر جنگ نے (جو نواب آصفجاہ کے نواسے تھے) ان کے حق کو قبول کرنے سے انکار کردیا، اور ایک دوسرے

مدعی حسین دوست خاں عرف چندا صاحب سے جو ارکاٹ کی حکومت حاصل کرنا چاہتا تھا، اتحاد کرکے ناصر جنگ کو بیدخل کرنے کی کوشش کی، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ پانڈیچری میں ڈوپلے جیسا داہیۂ سیاست فرانسیسی عملداری کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے دکن میں اپنے اثر کو بڑھانے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور دونوں مدعیوں کی حمایت کے لئے مستعد ہوگیا۔ انگریز مورخین کا بیان ہے کہ مظفر جنگ کی مدد پر فرانسیسی قوت کو دیکھکر ناصر جنگ کی مدد کے لئے انگریز کھڑے ہوگئے لیکن اس زمانہ میں انگریزوں کی کوئی ایسی طاقت نہ تھی، کہ صوبیدار دکن ان کی مدد کا طالب ہوتا۔ یا ان کی مدد کو خاطر میں لاتا۔ ممکن ہے کہ ایک آدھ انگریز پلٹن نواب کے ساتھ ہوگئی ہو، مگر دکن کے مورخین نے ان کو اتنی بھی اہمیت نہ دی کہ ان کا ذکر ہی کرتے۔

بہر حال ناصر جنگ اور مظفر جنگ کا مقابلہ ہوا۔ مظفر جنگ قید ہوگئے۔ اور ناصر جنگ فرانسیسیوں کی تادیب کے لئے پانڈیچری پر بڑھے، راستہ میں فرانسیسیوں نے لشکر دکن پر شب خون مارا۔ ہنگامۂ اضطراب میں کرنول کے نمک حرام افغانوں نے ناصر جنگ کو شہید کر دیا۔ اور اس طرح مظفر جنگ دکن کے فرمانروا ہوگئے۔ مظفر جنگ کی اس کامیابی نے افغانوں اور فرانسیسیوں کا اثر دربار دکن میں بہت بڑھا دیا لیکن ان دونوں قوموں میں خود باہم رقابت پیدا ہوگئی، فرانسیسی عنصر کا سردار موسیو بوسی تھا۔ اور افغانوں کا سردار ہمت بہادر خاں۔ دونوں کی فوجوں میں لڑائی ہوگئی، اور اس کشمکش میں مظفر جنگ اور ہمت بہادر خاں دونوں مارے گئے۔

فرانسیسی اثر کا زوال

اس کے بعد نواب آصفجاہ کے تیسرے بیٹے صلابت جنگ مسند آرائے سلطنت ہوئے

بوسی (Bussy) اور اس کی فرانسیسی فوج کا اثر اسوقت حیدرآباد میں پورے عروج پر تھا، بوسی کو سیف الدولہ، عمدۃ الملک غضنفر جنگ بہادر کا خطاب ہفت ہزاری منصب مع علم و نقارہ و ماہی و مراتب دیا گیا تھا، اور صلابت جنگ کی سفارش پر شاہ دہلی کی جانب سے اسکو خلعت و سرپیچ مع فیل خاصہ مرحمت ہوا تھا اسکی فوج کی معاش کیلئے سرکارات سیدکاکول، راجبندری، مصطفیٰ نگر، اور مرتضیٰ نگر (گنتور) بطور جاگیر دئے گئے تھے۔ اگر وہ دانائی و فرزانگی سے کام لیتا تو صوبہ دار دکن کی تائید فرانسیسیوں کے حق میں حاصل کر لیتا۔ اور شاید ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن اس نے اپنی کوتاہ فہمی سے یہ سمجھا کہ یہی وقت دکن پر قبضہ جمانے کے لئے موزوں ہے۔ چنانچہ اس نے سلطنت کے معاملات میں مداخلت شروع کی، اس کے دیوان رومی خاں نے جسے حیدر جنگ کا خطاب دیا گیا تھا۔ خود مدار المہام سلطنت، نواب صمصام الدولہ کے ساتھ مساوات کا دم بھرنا شروع کیا، اور ان دونوں نے اتنی سرکشی اختیار کی کہ آخر صلابت جنگ اور صمصام الدولہ ان سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔ اور انہیں خدمت سے برطرف کر دیا۔ اس برطرفی سے غضبناک ہو کر انہوں نے حیدرآباد میں فتنہ عظیم برپا کر دیا۔ چارمحل، چارمینار، اور حیدر محل پر توپیں لگادیں، داد محل پر مورچہ بنایا اور شہر کو برباد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ صلابت جنگ نے یہ رنگ دیکھ کر اسوقت کو نرمی سے ٹالدینا مناسب سمجھا، بوسی کو اس کی جگہ بحال کر دیا۔ اور حیدر جنگ کو ورنگل، کھمم اور ملنکور کی تعلقہ داری سپرد کی۔ لیکن اس سے ان دونوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد ایک فوجی سازش کر کے صمصام الدولہ اور میر حسین خاں کو گرفتار کر لیا۔ اور نواب میر نظام علی خاں

ولیعہد سلطنت کو بھی قلعہ گولکنڈہ میں قید کر دینے کی تدبیر شروع کر دی۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ اس سے سلطنت کا عین وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا، چنانچہ میر نظام علی خاں نے حیدر جنگ کو پکڑ واکر قتل کرا دیا۔ اور بوسی کے دوسرے ساتھی ابراہیم گارڈی کو توڑ لیا۔ اس طرح بوسی کا زور ٹوٹ گیا۔ اور اسکو حیدرآباد سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا پڑا۔

انگریزی اثر کی ابتدا

یہ حیدرآباد میں پہلی مرتبہ فرانسیسی اثر کے زوال کے اسباب ہیں۔ اسی زمانہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگ ہوئی۔ اور کرنل فورڈ (Forde) اس علاقہ میں گھس آیا جو سرکار نظام سے فرانسیسی فوجوں کی معاش کے لئے دیا گیا تھا۔ صلابت جنگ نے اپنے حدود سلطنت میں اس بجا دزبیجا کو دیکھکر انگریزوں کی تادیب کے لئے خود جانے کا قصد کیا۔ لیکن انگریز سمجھتے تھے۔ کہ صوبہ دار دکن سے بگاڑ کر ان کی خیر نہیں ہے اس لئے انہوں نے خود آگے بڑھ کے صلح کی درخواست کی۔ اور ۱۷۵۹ء (۱۱۷۲ھ) میں پہلا تہنامہ عمل میں آیا جس کی رو سے نظام دکن نے سرکا مسولی پٹم، سرکار نظام پٹم، اور اضلاع کونڈاویر، وواکلینسر انگریزی کمپنی کو انعام میں دئے۔ اور وعدہ کیا کہ اپنی ریاست سے فرانسیسی فوجوں کو نکالدیں گے۔

اس تہنامہ پر ابھی عملدرآمد نہ ہوا تھا کہ نواب میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی نے نواب صلابت جنگ کو معزول کر دیا اور خود عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس انقلاب کے بعد نواب غفران آب اپنی ریاست کے معاملات کی درستی میں

مشغول تھے کہ انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں قانون کے بالکل خلاف بالا بالا شاہ دہلی سے شمالی سرکاروں کی سند حاصل کرلی (حالانکہ دو سال پہلے معاہدہ پیرس میں وہ خود تسلیم کرچکے تھے کہ یہ علاقہ نظام کی ملک ہے) اور اس کے بعد جنرل کیلوڈ (Gen. Calliaud) کی قیادت میں ایک فوج بھی بھیجدی تاکہ اس علاقہ پر قبضہ کرلے۔ یہ قانون بین الملل کی ایک کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ اس سے ناراض ہوکر نواب نے کرناٹک پر دباؤ ڈالا جہاں انگریزوں کے اغوا سے نواب محمد علی خاں (ابن انورالدین خاں) خود مختار ہوگیا تھا۔ انگریزوں نے پہلے تو کرنل کیمپل کے زیر قیادت مزاحمت کی مگر بعد میں نواب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھکر خائف ہوگئے۔ اتنے بڑے فرمانروا سے لڑنے کی ان میں جرأت نہ تھی۔ دوسرے حیدرعلی کے ساتھ نظام دکن سے بھی بگاڑلینا ان کے حق میں سخت خطرناک تھا۔ اس لئے فورٹ سینٹ جارج کی پریسیڈنسی سے جنرل کیلوڈ صلح کی استدعا لیکر حیدرآباد بھیجا گیا۔ اور نومبر ۱۷۶۶ء میں اس نے سرکار نظام کے ساتھ ایک جدید تہنامہ مرتب کیا۔ اس تہنامہ کی رو سے انگریزوں نے شمالی سرکاروں کی سند ان کے قانونی مالک سے حاصل کی اور راجبندری سیکاکول ایلور اور مصطفیٰ نگر کی سرکاروں کے عوض ۷ لاکھ روپیہ سالانہ خراج دینا قبول کیا۔ اور مرتضیٰ نگر کے متعلق یہ طے ہوا کہ نواب بسالت جنگ (نواب آصفجاہ ثانی کے چھوٹے بھائی) کی زندگی میں یہ علاقہ ان کے زیر تصرف رہے گا۔ بعد میں وہ بھی انگریزوں کو مل جائے گا۔ اور اس کے عوض انگریزی کمپنی ۲ لاکھ سالانہ خراج سرکار نظام کو دے گی۔ اس کے مقابلہ میں انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ ہر ضرورت کے موقع پر سرکار نظام کی مدد کے لئے ایک فوج مستعد رکھیں گے۔

اس فوجی امداد کا خرچ اگر شمالی سرکاروں کے خراج سے کم ہوگا تو اسے رقم خراج میں سے وضع کر کے باقی ماندہ رقم سرکار میں داخل کی جائے گی، اور اگر خراج سے زیادہ ہوگا۔ تو زائد رقم کی ذمہ دار خود کمپنی ہوگی۔ یہ فوجی خدمات کا پہلا دام تھا۔ جسمیں نظام دکن کو پھانسا گیا۔ بعد میں اس نے جو جو شکلیں اختیار کی ہیں انکا ذکر آگے آتا ہے

حیدر علی کے خلاف اتحاد

مذکورہ عہدنامہ کے مطابق نظام دکن کی خدمت کے لئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھنا انگریزوں کا فرض تھا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب حیدر علی کی قوت سے انگریزی مقبوضات کو خطرہ لاحق ہوا تو یہ فوج اگست ۱۷۶۷ء میں حیدرآباد سے واپس بلالی گئی۔ اور اسے انگریزی مقبوضات کی حفاظت پر لگا دیا گیا۔ نواب آصفجاہ ۱۷۶۶ء کے عہدنامہ کی پابندی کرتے ہوئے حیدر علیخاں کے خلاف انگریزوں کی مدد کرنے پر مستعد ہو چکے تھے مگر ان کی اس بدعہدی کو دیکھکر ناراض ہو گئے۔ اور ان کی مدد سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر رکن الدولہ مدارالمہام نے حیدر علی کی سفارش کی خود حیدر علی نواب کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا۔ اور جب نواب بازدید کے لئے اس کے ہاں گئے تو جلو خانے تک آکر آداب و مجرا بجا لایا، ۱۵ ہزار روپیہ نقد اور دو ہزار پتلیاں سونے کی نذر میں پیش کیں، چبوترۂ زر پر بیٹھا کر بٹھایا، جواہر کے خوان، پارچہ و پوشاک، دو عدد قلادۂ فیل، اور دو تین توپیں نذر گذرانیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اگر سلطنت دکن اور ریاست میسور کا دائمی اتحاد ہو جاتا تو کم از کم جنوبی ہند پر اسلامی سلطنت از سر نو مستحکم ہو جاتی، مگر مشیت الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ نواب آصفجاہ کی

واپسی پر دربار کا رنگ پھر بدلا۔ نواب والا جاہ محمد علی خاں والی کرناٹک نے جو انگریزوں کے ہاتھ اپنے آپکو بیچ چکا تھا، حاضر ہو کر نہ معلوم کیا پٹی پڑھائی کہ نواب غفران مآب کا مزاج پھر حیدر علی سے منحرف اور انگریزوں کی جانب منعطف ہو گیا اس کے بعد ہی رکن الدولہ مدراس بھیجے گئے۔ اور وہاں فروری ۱۷۶۸ء میں ایک تہنامہ مرتب ہوا جس کی رو سے نواب آصفجاہ نے کرناٹک کی دیوانی سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض انگریزوں کے سپرد کی۔ نواب کرناٹک کے معاملات میں مداخلت سے دست برداری لکھی۔ اور انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ سپاہیوں کی دو پلٹنیں گولندازوں کی کافی تعداد سمیت، نواب کی خدمت میں دیں گے جس کا خرچ نواب کو دینا ہوگا۔ مگر یہ فوج ایسی طاقتوں کے ساتھ استعمال نہ کی جائے گی جن سے انگریزی کمپنی کی دوستی ہو۔

یہ اسی سبسڈیری الائنس (Subsidiaryalliance) کی بنیاد تھی جس نے بعد میں ترقی کر کے ریاست کی جڑ کو کھوکھلا کر دیا۔ افسوس! اسوقت کوئی ایسا صاحب نظر سیاست داں موجود نہ تھا جو اس حقیقت کو سمجھتا کہ سلطنت کا استحکام اس کی اپنی طاقت پر منحصر ہوتا ہے، نہ کہ کسی حلیف کی مدد و اعانت پر۔

سرکار گنتور پر ناجائز تصرف

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۷۶۶ء میں سرکار گنتور کے متعلق کمپنی سے یہ عہد ہوا تھا کہ بسالت جنگ کی زندگی تک یہ علاقہ ان کی جاگیر میں رہے گا۔ اس کے بعد پھر کمپنی کو مل جائے گا۔ لیکن انگریز ملک گیری کی ہوس میں بے چین ہو رہے تھے۔

بسالت جنگ کے مرنے تک صبر کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ اور انہوں نے شہزادہ کو حیدر علی کے خطرہ سے ڈرا کر ۱۷۶۹ء میں اس سے سرکار گنتور کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اور اسے نواب کرناٹک کو دس سال کے پٹہ پر دے بھی دیا۔ یہ نہ صرف ایک صریح بدعہدی تھی بلکہ ایک حلیف کی رعایا سے ناجائز ساز باز کرنا اور اس کے ملک پر بیجا تصرف کرنا تھا۔ جس کو نظام ایک معاندانہ فعل قرار دینے میں حق بجانب تھے، انہوں نے اس حرکت پر سختی کے ساتھ احتجاج کیا۔ اور احتجاج کو موثر بنانے کے لئے فرانسیسی فوج کو پھر ملازم رکھ لیا۔ اس معاملہ کی خبر کلکتہ پہونچی تو سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ گورنر نے نومبر ۱۷۷۹ء میں نواب کو ایک طویل معذرت نامہ لکھا، خود کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اس معاملہ کی تحقیقات کی۔ اور آخر نواب کو خوش کرنے کے لئے نہ صرف سرکار گنتور واپس کی گئی، بلکہ سر ولیم رمبالڈ Sir W. Rumbald) گورنر مدراس کو اس کی کونسل کے" ارکان سمیت برطرف کر دیا گیا

شمالی سرکار کی واپسی کا مطالبہ اور اس کا حشر

بسالت جنگ کے انتقال کے بعد ۱۷۸۲ء میں کمپنی کی طرف سے مسٹر جانسن کو وکیل بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ تاکہ سرکار گنتور کی حوالگی کا مطالبہ کرے۔ اس زمانہ میں نواب کو اپنی پہلی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور انہوں نے ملک دیگر اجنبی طاقتوں سے فوج رکھوانے کے انجام کو سمجھ لیا تھا۔ اس لئے انگریزی وکیل کے سامنے انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ کمپنی شمالی سرکاروں کو واپس کر دے اور اس کے عوض سرکار نظام نہ صرف پیشکش کا بقایا معاف کر دیگی، بلکہ ایک کرور روپیہ نقد بھی

کمپنی کو دے گی، اس کے ساتھ نواب غفران مآب نے کرناٹک کی واپسی کے لئے بھی ایسی ہی تجاویز پیش کی تھیں۔ مسٹر جانسن نے ان تجاویز کو پسند کیا۔ اور سپریم گورنمنٹ کو ان کی منظوری کے لئے لکھا لیکن وہاں سے سختی کیساتھ انہیں رد کر دیا گیا۔ اور اس قصور میں کہ غریب جانسن نے ان تجاویز کو سنا بھی کیوں؟ اسی منصب وکالت سے برطرف کر دیا گیا[۵۱]

سرکار گنتور کی باقاعدہ تفویض

۱۷۸۸ء میں لارڈ کارنوالس نے کیپٹن کنوے (Kennaway) کو پہلی مرتبہ ریزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا۔ اور اسے شمشیر جنگ کے باغ میں ٹھہرایا[۵۲] گیا۔ اس مرتبہ سرکار گنتور کی تفویض کا مطالبہ صرف زبانی ہی نہیں پیش کیا گیا۔ بلکہ سلطنت آصفیہ کی سرحدوں پر فوج کا اجتماع بھی کیا گیا۔ تاکہ اگر نظام کچھ پس وپیش بھی کریں تو انہیں فوجی خدمات کے عوض ملک دینے کی سزا دی جائے اب نظام کو اچھی طرح معلوم گیا کہ خود اپنا ملک دیکر فوج رکھوانے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مگر اس کا تدارک اب ان کے بس کا نہ تھا، مجبوراً انہیں قدرتی نتائج

---

۵۱ Our faithful ally the Nizam P. 36

۵۲ اس مقام پر حکومت نظام نے بعد میں ۲۰ لاکھ کے صرفہ سے ایک عظیم الشان کوٹھی انگریزی وکلا کے قیام کے لئے تعمیر کرا دی تھی مگر احسان نوازی کے جرم میں ریاست کو یہ سزا دی گئی کہ نہ صرف اس عمارت پر بلکہ اس کے اردگرد شہر حیدرآباد کے ایک اچھے خاصے حصہ پر بھی قبضہ کر لیا گیا چنانچہ آج حیدرآباد میں ریزیڈنسی کا ایک پورا محلہ انگریزی تصرف میں ہے (تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۲۹۹)

۵۳ Our faithful ally P. 37

کے آگے سر جھکا دینا پڑا۔ اور شمالی سرکار کی واپسی کے خیال سے ہاتھ دھو کر اپنے ملک کے ایک اور حصہ کی علیحدگی گوارا کرنی پڑی۔

ب تک کمپنی نے اس ملک کا پیشکش بھی ادا نہیں کیا تھا جو ۱۷۶۶ء اور اور ۱۷۶۸ء کے معاہدوں کی رو سے اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ رقم ۶۷۴۹۲۳۲ روپے تک پہونچ چکی تھی۔ نظام نے اس کا مطالبہ کیا۔ لیکن کمپنی نے صرف ۹۱۶۶۶۵ روپے پیش کئے۔ اور ۵۸۳۲۶۶۷ روپے اس بہانہ سے کاٹ لئے کہ یہ بسالت جنگ کے انتقال (ستمبر ۱۷۸۲ء) سے لیکر سرکار گنتور کی تفویض (ستمبر ۱۷۸۸ء) تک کا ہرجانہ ہے۔[1]

میر عالم کی سفارت

۱۷۸۹ء میں بعض معاملات کے تصفیہ کے لئے سرکار نظام کی طرف سے ایک ہیئت سفرا کلکتہ بھیجی گئی۔ جو عاقل الدولہ۔ نظام یار جنگ، میر عبدالغنی خاں، غلام نبی خاں، اور میرزا ابوتراب خاں سے مرکب تھی اور میر عالم اس کے صدر تھے۔ اس سفارت کی گفت و شنید سے ایک اور عہدنامہ عمل میں آیا۔ جو لارڈ کارنوالس کے ایک خط کی صورت میں ہے۔ اس میں لارڈ کارنواالس نے اس امر کی تصریح کی کہ جو فوج نواب آصفجاہ کے خرچ پر رکھی گئی ہے، وہ ہر ایسے موقع پر ان کی خدمت کے لئے حاضر رہے گی جبکہ وہ اسے طلب کریں، لیکن اسے پیشوا، رگھوجی بھونسلہ، مادھوراؤ سندھیا، نواب ارکاٹ، اور راجایان چنا درو ٹراونکور کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔

[1] Our faithful ally P. 37

اس کا صاف مطلب یہ تہا کہ یہ فوج صرف ٹیپو سلطان کے مقابلہ کے لئے رکھی گئی تھی۔ کیونکہ نظام کے تمام ہمسایہ رئیسوں اور نوابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد صرف ایک ٹیپو سلطان ہی باقی رہگیا تہا۔

اس خط میں یہ بھی تصریح کردی گئی تھی کہ آیندہ شمالی سرکاروں کے مسئلہ کو چھیڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے یعنی یہ علاقہ جو سلطنت دکن سے علیحدہ کیا جا چکا ہے۔ اب کسی حال میں اصل مالک کو نہ ملے گا۔

ٹیپو سلطان کے خلاف اتحاد

یہ وہ زمانہ تہا جبکہ ٹیپو سلطان کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اور انگریز سمجھتے تھے کہ اگر اس اولوالعزم سپاہی کو دس پانچ برس کی بھی مہلت مل گئی تو پھر کم از کم جنوبی ہند میں ان کا قدم ٹکنا محال ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے یہ عزم کیا کہ اس سرچشمہ کو طوفان بننے سے پہلے ہی بند کر دینا چاہئے۔ لیکن ٹیپو سلطان تنہا انگریزوں کے بس کا نہ تھا۔ نظام اور مرہٹوں کی امداد کے بغیر اسکا زور توڑنا ناممکن تہا۔ اور کم از کم نظام کو ان کے ایک ہم مذہب رئیس کے مقابلہ میں شرکت جنگ پر آمادہ کرنا مشکل تھا۔ لہذا اس کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی کہ ایک طرف ٹیپو کی اولوالعزمیوں کو خود نظام کے لئے خطرناک ظاہر کیا گیا دوسری طرف ان کے سامنے یہ فائدے کی صورت پیش کی گئی کہ اگر ٹیپو کو مغلوب کر لیا گیا تو ملک اتحادیوں پر برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ یہ تدبیر کارگر ہو گئی۔

جولائی ۱۷۹۰ء میں نواب آصف جاہ، پنڈت پردہان پیشوا، اور کمپنی بہادر کے

درمیان دفاعی و ہجومی اتحاد کا معاہدہ ہوگیا۔ اور اس کے بعد ہی تینوں قوتوں نے میسور پر حملہ کر دیا۔

اس جنگ میں نظام الملک کی اعانت کے لیے کمپنی نے وہ فوج بھیجی جو خود نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی۔ لیکن یہ فوج اس قدر ناقص و ناکارہ تھی کہ اس سے جنگ میں کوئی کام نہ لیا جا سکتا تہا۔ خود ریزیڈنٹ (کپتان کنوے) نے اعتراف کیا کہ "وہ نہایت غیر فوجی اور غیر مکمل حالت میں تھی"۔ نظام نے جب اس کی سختی کے ساتھ شکایت کی تو لارڈ کار نوالس نے معذرت نامہ لکھا جس میں اُس نے صاف طور پر تسلیم کیا کہ۔

"ہز ہائینس کمپنی سے اس امر کی شکایت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ سرکار کمپنی ان کی ایسی اعانت کرنے سے قاصر رہی جس کے وہ معاہدہ اور پیہم مواعید کی رو سے مستحق تھے"[1]

بہرحال نظام نے وفائے عہد کا حق ادا کیا اور جنگ میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپو کو شکست ہوئی اسے آدھا ملک اتحادیوں کے سپرد کرنا پڑا۔ اور اس مفتوحہ علاقہ میں سے نظام کے حصہ میں ۱۳۱۶۶۶۶ اھن کا ملک آیا۔

انگریزوں کی بیوفائی اور فرانسیسی اثر کا دوبارہ عروج

جنگ میسور کے خاتمہ کے بعد ہی دولت آصفیہ کے ایک ماتحت رئیس

---

[1] Memoirs and Correspondence of Fraser P. 470

جاگیردار کرنول کی تابعیت کے مسئلہ میں نظام اور ٹیپو سلطان کے درمیان نزاع برپا ہوئی۔ جسے طے کرنے کے لئے نظام نے اس فوج کو طلب کیا جو خود انہیں کے روپے سے رکھی گئی تھی۔ لیکن کمپنی نے اس کے دینے میں انتہا درجہ کی ٹال مٹول کی۔ اور محض فوجی خدمت سے بچنے کے لئے یہاں تک کیا کہ کرنول پر نظام کے قانونی حقوق تک تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[۱]

اس کے بعد نظام کو ایک ایسے علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے فوج کی ضرورت پیش آئی۔ جو معاہدۂ سرینگ پٹن کی رو سے ان کے حصہ میں آیا تھا۔ اس کام کے لئے انہوں نے پھر کمپنی سے اپنی فوج طلب کی۔ مگر پھر اُسے بھیجنے سے انکار کر دیا گیا۔

۱۷۹۴ء میں کرنول کے نئے رئیس، الف خان نے کھلم کھلا نظام کی اطاعت سے انحراف کر کے ٹیپو سلطان کی اطاعت اختیار کر لی۔ نظام نے چاہا کہ کمپنی کی فوج بھیجکر اسے راہ راست پر لائیں، مگر اس مرتبہ بھی فوج دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔

سرجان شور (گورنر جنرل) نے صاف الفاظ میں لکھدیا کہ :۔

"ریزیڈنٹ کو نظام پر یہ امر واضح کر دینے کے ہر مناسب موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے کہ، کمپنی کی فوج کے ان کی خدمت میں حاضر رہنے کو ہماری باہمی دوستی کی ایک علامت سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ اسے نظام کی سرکش رعایا سے خراج وصول کرنے کا ایک ذریعہ سمجھا جائے۔"[۲]

---

[۱] Our faithful ally the Nizam P. 55

[۲] ایضاً صفحہ ۲۔۲۷۰

ان بہیم واقعات سے نظام پر اچھی طرح روشن ہو گیا کہ کمپنی کی فوج ان کے کسی کام کی نہیں ہے بلکہ کمپنی نے اسے انکے خرچ پر اپنی خدمت کے لئے رکھا ہے اسی زمانہ میں مرہٹوں سے نظام کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے۔ مرہٹوں کی جانب سے چوتھ کے بقایا کا مطالبہ سخت تھا۔ اور نظام کو ہر وقت مرہٹہ فوج کے حملہ کا اندیشہ لگا ہوا تھا۔ نظام نے کمپنی کے رویہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی طرح بھی ان کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں ہے۔ اور اپنے وفادار حلیف کے لئے حد سے حد یہی کر سکتی ہے کہ مصالحت کی کوشش کر دے۔ دوسری طرف جب مرہٹوں کی طاقت کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک فرانسیسی افسر موسیو دہ بونیے (M. de Boigne) کی قیادت میں ایک زبردست باضابطہ فوج قائم کر لی ہے۔ ان حالات کو دیکھکر نظام نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کی ناکارہ فوج سے اپنا پیچھا چھڑائیں اور اپنی ایک مستقل باضابطہ فوج مرتب کریں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ایک فرنچ افسر موسیو ریمونڈ (M. Raymond) کو جو موسیٰ رحمو کے نام سے مشہور رہے۔ ملازم رکھا گیا اور اس کے ماتحت دیسی اور یوروپین فوجوں کے دستے مرتب کئے گئے اس کے علاوہ چند اور امریکن فرنچ اور برٹش افسروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔

ان افواج کی ترتیب کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں سے جنگ چھڑ گئی۔ مقام کھرڈلہ پر سخت معرکہ ہوا جس میں نظام کو شکست ہوئی اور انہیں اس شرط پر صلح کرنی پڑی کہ ۳۰ لاکھ کا ملک اور ۳ کروڑ روپیہ نقد مرہٹوں کو دینگے اور ارسطو جاہ کو یرغمال کے طور پر ان کے سپرد کر دینگے۔ یہ محض اس کا نتیجہ تھا کہ

نظام نے کمپنی کی دوستی پر بھروسہ کیا۔ اور پہلے ہی خود اپنی فوجی قوت کو مضبوط کرنے کی کوشش نہ کی۔

جنگ کھرڈلہ سے واپس ہوتے ہی نظام نے انگریزی پلٹنوں کی برطرفی کا حکم دیدیا اور موسی رحمو کی جمعیت کو ترقی دینی شروع کی یہاں تک کہ وہ ۱۵ ہزار کی تعداد تک پہنچ گئی۔ اور اس کے لیے ۰۰۰۰ ۱۲ روپیہ ماہانہ مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ حیدرآباد میں ایک جنگی کارخانہ بھی قائم کیا گیا جس میں ہر قسم کا بہترین سامان جنگ طیار ہوتا تھا۔ ان واقعات سے بہت ممکن تھا کہ حالات ایک نیا رخ بدل لیتے، اور تاریخ کوئی دوسری شکل اختیار کرتی۔ لیکن اس زمانہ میں ایک زبردست سازش کھڑی ہوگئی شاہزادہ عالیجاہ کو باپ کے خلاف بغاوت پر ابھارا گیا۔ بیدر کے زمیندار اس کے ساتھ مل گئے۔ مرہٹوں کی امداد بھی اس کو حاصل ہوگئی۔ اور نظام کا تخت خود ان کے اپنے جگر گوشہ کے ہاتھوں خطرہ میں پڑ گیا۔ ایسی حالت میں نظام دوبارہ کمپنی سے امداد طلب کرنے پر مجبور ہوگئے اور وہی فوجیں جن کی برطرفی کا حکم دیا جاچکا تھا مجبوراً پھر مانگ لی گئیں۔ تاہم ابھی تک فرانسیسی اثر پورے زور پر تھا۔ ولیعہد سلطنت نواب سکندر جاہ کی موسی رحمو سے بیحد موافقت تھی۔ یہاں تک کہ وہ رحمو کے سر کی قسم کھایا کرتے تھے۔ دربار میں اس کے اثر کا یہ عالم تھا کہ ہر پارٹی اس کی تائید حاصل کرنے کی خواہشمند تھی۔ اور اس کی مخالفت کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ باوجودیکہ دربار کے بڑے بڑے امرا شاہزادہ فریدوں جاہ کو ولیعہد بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر

چونکہ رحمو شاہزادہ سکندر جاہ کا مؤید تھا اسلئے سب دم بخود تھے ۱۷۹۶ء میں جب نواب غفران مآب سخت بیمار تھے تو ریزیڈنٹ نے گورنر جنرل کو لکھا تھا کہ

بلا شک و شبہ یہ فرانسیسی اسوقت ایسی پوزیشن میں ہے کہ نظام کا انتقال ہوجانے کی صورت میں وہ جس کو چاہے گا مسند نشین کرادیگا۔ ۵۱

اس زمانہ میں ٹیپو سلطان نے نواب آصف جاہ کو انگریزوں کے خلاف ایک جہاد عام میں شرکت کی دعوت دی اور ایک طویل خط لکھا جس میں قرآن و حدیث کا حوالہ دیکر نواب کو اس فریضۂ دینی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ مل کر ان ممالک کو کفار سے واپس لیں جو پہلے دارالاسلام رہ چکے ہیں۔ ایک طرف ان باتوں کا اور دوسری طرف انگریزوں کی سابق بیوفائیوں کا نظام پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے انگریزی ریزیڈنٹ کیپٹن کرک پیٹرک کو حکم دیدیا کہ وہ کمپنی کی فوجوں کو واپس بھیجدے۔ قریب تھا کہ انگریزی کمپنی سے نظام کے تعلقات منقطع ہوجاتے۔ مگر عین وقت پر سیاسی فریب کاری نے کمپنی بہادر کی دستگیری کی۔ ریزیڈنٹ نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ نظام اور ٹیپو سلطان کے مابین کرنول کا جھگڑا کھڑا کردیا۔ میر عالم نے اس کام میں ریزیڈنٹ کی امداد کی۔ اور بڑے وثوق کے ساتھ نظام کو یقین دلادیا کہ ٹیپو نے

---

۵۱ Our Faithful ally P. 459

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۱۲-۲۱۳

کرنول پر قبضہ کر لینے کا پورا سامان کر لیا ہے۔ انگریزوں کی خوش قسمتی سے اسی زمانہ میں ارسطو جاہ بھی پونا سے چھوٹ کر آگئے۔ اور انہوں نے بھی اپنی قوت اسی جماعت کی تائید میں شامل کر دی۔ جو ٹیپو سلطان کے ساتھ نظام کے اتحاد کی مخالف تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ٹیپو کے وکلا ناکام و نامراد واپس گئے۔ اور انگریزی فوجوں کی واپسی کا حکم واپس لے لیا گیا۔

انگریزوں سے ازسر نو اتحاد

اس موقع پر قدرت نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مارچ ۱۷۹۸ء میں موسی رحمو مر گیا۔ اور اس کی جگہ ایم پیرون (M. Perron) مقرر ہوا جو اپنے پیشرو کی سی قابلیتیں نہ رکھتا تھا۔ ان واقعات نے دفعتاً حالات کے رخ کو بدل دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے بدل دیا۔ نظام کی مرہٹوں سے پہلے ہی دشمنی تھی۔ اب انگریزوں کی چالاکی سے ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ٹھن گئی اتنے دشمنوں میں تنہا اپنی سلطنت کا وجود قائم رکھنا ان کے لئے مشکل تھا اسلئے انہوں نے دوبارہ انہی بیوفا دوستوں کی طرف رجوع کیا۔ جو محض اپنے فائدے کے لئے دوستی کرنے کے عادی تھے۔ انگریز ٹیپو کا سر کچلنے اور اس کے بعد مرہٹوں کا استیصال کرنے کے لئے اس کے دل سے آرزو مند تھے۔ دکن میں ان کی ساری سیاست کا محور یہی ایک نقطہ تھا کہ نظام سب طرف سے کٹ کر صرف ہماری ہی دوستی پر بھروسہ کرنے لگیں۔ جیسا کہ

لارڈ ولزلی نے بورڈ آف کنٹرول کو لکھا تھا کہ اس زمانہ میں انگریزی قوم کے لئے بہترین پالیسی یہی تھی کہ "نظام کے وزن کو ہندوستانی طاقتوں کے پلڑے میں شامل ہونے سے روک دیں" چنانچہ ٹیپو کی طرف سے نواب کے انحراف طبع کو دیکھتے ہی انگریزوں نے دوستانہ اتحاد کی درخواست پھر پیش کی۔ اور ستمبر ۱۷۹۸ء میں ایک جدید عہدنامہ رقم پذیر ہوا جس کی رو سے انگریزوں کی جمعیت تعلبندی (Subsidiary force) کو مستقل کر دیا گیا۔ اس کی تعداد بڑھا کر چھ پلٹنوں تک کر دی گئی۔ اس کے لئے سرکار نظام کے خزانہ پر ۲۴۱۷۱۰۰ روپیہ سالانہ کا بار ڈالا گیا۔ اور اس کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ نظام کی ذات اور ان کی سلطنت کی حفاظت کرے۔ اور ریاست کے باغی سرداروں کی سرکوبی کرے۔ مگر یہ شرط لگا دی گئی کہ چھوٹے چھوٹے کام اس سے نہ لئے جائیں گے۔ اور نہ مالگذاری وصول کرنے کے لئے سبندی کا کام اس سے لیا جائے گا۔ اور نہ کمپنی کے دوستوں کے خلاف اس کو استعمال کیا جائیگا۔ اس کے عوض حکومت نظام نے وعدہ کیا کہ اس فوج کے پہنچتے ہی فرانسیسی فوجوں کو منتشر کر دیگی اور آئندہ کسی فرانسیسی کو اپنے ہاں ملازم نہ رکھے گی اور کسی یورپین کی خدمات کمپنی کی رضامندی کے بغیر حاصل نہ کرے گی۔

اس عہدنامہ پر دستخط ہونے کے بعد ہی کمپنی کی فوجیں حیدرآباد پہنچ گئیں۔ فرانسیسی افسروں کے ماتحت نظام کی باقاعدہ فوج کو زبردستی منتشر کیا گیا۔ اور جتنے فرانسیسی سرکار نظام کے ملازم تھے ان کو گرفتار کر کے یورپ بھیج دیا گیا۔[1]

ٹیپو سلطان کا استیصال

---

[1] Our faithful ally the Nizam P 219-20

۱۷۹۰ء کا یہ معاہدہ انگریزی ڈپلومیسی کی عظیم الشان فتح تھا۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے آخری اور فیصلہ کن مقابلہ کیلئے جو زبردست طیاریاں کی تھیں انہیں اگر نظام الملک کی طاقت اسکے ساتھ شامل ہوجاتی تو ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن انگریزوں نے ایک طرف ان دونوں اسلامی فرمانرواؤں میں پھوٹ ڈالی۔ دوسری طرف ۱۵ ہزار کی زبردست فوج کو جو سلطنت آصفیہ کی جنگی طاقت کا سب سے بڑا سہارا تھی ایک قطرۂ خون بہائے بغیر منتشر کردیا۔ اور تیسری طرف مملکت آصفیہ کے وسیع ذرائع ثروت و قوت کو اپنی تائید میں حاصل کرلیا۔ جن سے جنوبی ہند میں ان کو فیصلہ کن قوت حاصل ہوگئی۔ اور جن کی بدولت وہ مرہٹہ اور میسور کی طاقتوں کو فنا کرکے ماورائے وندھیاچل کے مالک و مختار بن گئے۔ یہ نتائج تنہا انگریزوں کی چالاکی ہی سے حاصل نہیں ہوئے بلکہ ہندوستانیوں کی اپنی کمزوریوں نے بھی اس میں برابر کا حصہ لیا۔ اسوقت دکن میں تین زبردست طاقتیں تھیں۔ ایک مرہٹے، دوسرے نظام۔ تیسرے میسور۔ اگر ان تینوں طاقتوں میں حسن تفاہم اور اتحاد ہوتا تو انگریزوں کے پاؤں جمنے مشکل تھے لیکن بدقسمتی سے ان تینوں میں باہم سخت رقابت تھی۔ مرہٹے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ٹیپو سلطان اپنے مجاہدانہ خلوص کے باوجود ملک گیری کی خواہش سے خالی نہ تھا۔ اور نظام الملک اپنے گردوپیش کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے ان دونوں ہمسایوں پر اعتماد نہ کرسکتے تھے۔ اس سوء تفاہم اور بے اعتمادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو دکن کی بساط پر خود دکن کے مہرے لڑانیکا اچھا موقعہ ہاتھ آگیا۔ پہلے نظام اور مرہٹوں کو ملا کر انہوں نے میسور کا استیصال کیا۔ پھر نظام کی مدد سے مرہٹوں کا زور توڑا اور اس کے بعد ارادہ تھا کہ نظام کی سلطنت کو بھی ہضم کرجائیں جیسا کہ آگے چلکر معلوم ہوگا مگر خدا کو اس دولت اسلامیہ کا بقا مقصود تھا۔ اس لئے ساری بلا صرف برار پر ٹل گئی اور

اسلام کی عظمت رفتہ کا یہ نشان اس ملک میں محفوظ رہ گیا۔

واقعات کے سلسلہ کو جوڑتے ہوئے اب ہم اس زمانہ پہنچتے ہیں جبکہ انگریزوں نے اپنی تدبیروں کا جال مکمل کرنے کے بعد اطمینان کیساتھ ٹیپو سلطان کا خاتمہ کر دیا۔ نواب آصفجاہ سے معاہدہ ہونے کے بعد ہی ۱۷۹۹ء میں میسور سے جنگ چھیڑ دی گئی۔ ٹیپو سلطان اپنی تمام تدبیروں میں ناکام ہو چکا تھا۔ تنہا اپنی فوجی قوت سے مقابلہ نہ کر سکا۔ اور آخر اپنے منصوبوں کی تکمیل میں جان لڑاتے ہوئے شہید ہو گیا۔ اس کے بعد از روئے انصاف ملک کو نظام اور کمپنی کے درمیان مساویانہ تقسیم ہونا چاہئے تھا مگر لارڈ ولزلی نے نظام کو صرف ۲۴۲۰۶۰۷ ھن کا ملک دیا۔ اور میسور کی ریاست راجگان میسور کے قدیم خاندان کے سپرد کر دی اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ میسور کو تقسیم کرنے کی صورت میں لارڈ ولزلی کو اندیشہ تھا کہ نظام کے ہاتھ ایسے مضبوط قلعے آجائیں گے جن سے برطانی سرحد ہمیشہ خطرے میں رہے گی۔

۱۸۰۰ء کا معاہدہ

اس خرخشہ سے نجات پانیکے بعد کمپنی کی سیاست کا رخ مرہٹوں کی طرف پھر گیا اور اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس طاقت کا بھی خاتمہ کر دیا جائے دوسری طرف نظام کی سلطنت میں میسور کی لڑائیوں سے جو افزایش ہو گئی تھی اس کا تدارک بھی ضروری تھا۔ تیسری طرف انگریزی سلطنت کے مزید استحکام کے لئے اس امر کی ضرورت محسوس کیجا رہی تھی کہ ہندوستانی ریاستوں میں باہم کسی قسم کے تعلقات باقی نہ رہیں۔ کیونکہ ان کے آپس کے تعلقات سے یہ اندیشہ تھا کہ شاید وہ کبھی باہم متحد ہو کر کمپنی کی توسیع مملکت میں مزاحم ہوں۔ ان اغراض سہ گانہ کو پیش نظر رکھکر لارڈ ولزلی نے نظام سے ایک نئے معاہدہ کے لئے گفت و شنید شروع کی اور آخر ۱۲ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ایک عہدنامہ مرتب ہوا جسنے انگریزی حکومت کیساتھ نظام کے تعلقات کو ایک نئی بنیاد پر قائم کیا۔ اس عہدنامہ کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) دونوں سلطنتوں نے وعدہ کیا کہ اگر کوئی تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے گی تو دونوں ملکر اس کا مقابلہ کریں گی۔ نیز برٹش گورنمنٹ نے عہد کیا کہ وہ کسی طاقت کو نظام کے ممالک محروسہ پر حملہ نہ کرنے دیگی اور خود اپنے مقبوضات کی طرح نظام کے مقبوضات کی بھی حفاظت کرے گی (جنگ کھڑلہ کے موقع پر نظام اسی قسم کے اتحاد کے خواہشمند تھے۔ مگر چونکہ اسوقت میسور کی مہم پیش نظر تھی۔ اس لئے مرہٹوں کو خوش رکھنے کے لئے ایسا اتحاد کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا)

(۲) اس مدافعت کے کام میں کمپنی کی مدد کرنے کے لئے طے ہوا کہ جمعیت نعلبندی (Subsidiary force) میں مستقل طور پر دو پلٹنوں کا اضافہ کر دیا جائے (یعنی کل ۸ ہزار فوج رکھی جائے۔)

(۳) اس فوج کے مصارف ادا کرنے کے لئے نظام نے وہ تمام ملک کمپنی کے سپرد کیا جو ۱۷۹۲ء اور ۱۷۹۹ء کی جنگہائے میسور میں ان کے ہاتھ آیا تھا۔ اور جس کی سالانہ آمدنی ۶۳ لاکھ روپیہ تھی۔

(۴) کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں نظام نے وعدہ کیا کہ جمعیت نعلبندی کی ۲ پلٹنوں کے علاوہ وہ خود اپنی فوج میں سے ۱۵ ہزار سپاہی مع ساز و سامان گورنمنٹ کی مدد کے لئے بھیجیں گے۔

(۵) نظام نے عہد کیا کہ وہ کمپنی کی اطلاع کے بغیر کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کے تعلقات نہ رکھیں گے۔ اسکے عوض کمپنی نے عہد کیا کہ وہ نظام کی اولاد، ان کے اعزہ، ان کی رعایا، اور ان کے ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ

رکھے گی جنکے حق میں نظام کے اختیارات مطلق ہوں گے

(۶) دوسری طاقتوں سے حکومت نظام کی نزاع ہونے کی صورت میں کمپنی کی حکومت کو فیصلہ کرنے کا کامل اختیار ہوگا۔

(۷) کمپنی نے وعدہ کیا کہ اگر شوراپور اور گدوال کے زمیندار یا نظام کے دوسرے ماتحت سرداران کے جائز حقوق اداکرنے سے احتراز کریں گے یا اُنکے ممالک محروسہ میں غدر وفتنہ برپا کریں گے تو جرم کی حقیقت کو اچھی طرح معلوم کرنے کے بعد جمعیت تعلبندی الکو تنگون رکرنے کے لئے ہزہائینس کی افواج کے ساتھ شرکت عمل کرے گی[ا]

اس معاہدہ کی اکثر شرائط ایسی تھیں جنکو انگریزی حکومت نظام سے تسلیم کرانے کے لئے عرصہ سے بے چین ہو رہی تھی۔ خصوصًا پانچویں اور چھٹی شرط کی انہیں خاص ضرورت تھی تاکہ نظام برٹش سلطنت کی حمایت (Protection) کو قبول کرکے اپنی خارجی آزادی سے دست بردار ہو جائیں۔ نومبر ۱۷۹۹ء میں جب نواب غفران مآب میر نظام علی خاں سخت بیمار تھے۔ اور زندگی کا بھروسہ نہ رہا تھا۔ تو نواب سکندر جاہ کے سامنے یہی شرائط پیش کی گئی تھیں اور ان سے صاف کہدیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ان کی مسندنشینی کی تائید صرف اس صورت میں کرسکتی ہے کہ وہ ان شرائط کو قبول کرلیں[۲]۔

ا Aitchison's Treaties and Engagements Vol. IX PP. 67-73

۲ Wellington's Despatches. May 19, 1803

میر نظام علی خاں کا انتقال اور دورِ مصائب کا آغاز

اگست ۱۸۰۳ء میں نواب میر نظام علی خاں کا انتقال ہوا۔ اور ان کی جگہ نواب سکندر جاہ مسند نشین ہوئے۔ غفران مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی انگریزوں نے مدار المہام سلطنت ارسطو جاہ سے ساز باز کرکے نواب سکندر جاہ کو بے بس کر دیا تھا مگر سال بھر بعد جب ارسطو جاہ بھی مر گئے تو انگریزوں کو قدم جمانے کا پورا موقع مل گیا اور انھوں نے اپنے پرانے دوست میر عالم کو جنھوں نے دکن میں انگریزی اثر کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ اور جن کو لارڈ کارنوالس نے نواب غفران مآب کی زندگی ہی میں وزارت امور خارجہ کا عہدہ نسلاً بعد نسل دلوانے کا ارادہ کر لیا تھا۔[1] مدار المہامی پر مامور کرا دیا۔ گو انگریزی حکومت کو مدار المہام کے انتخاب اور تقرر کے مسئلہ میں، بلکہ سرکار نظام کے کسی داخلی مسئلہ میں بھی مداخلت کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن اگر ناجائز فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ملتا ہو، تو اس سے فائدہ نہ اٹھانا انگریزی ڈپلومیسی میں گناہ ہے۔ اسلئے انگریزی سلطنت نے معاہدانہ پابندیوں کو بالائے طاق رکھکر سرکار آصفیہ کے اس خالص اندرونی مسئلہ میں پہلی مرتبہ مداخلت کی ابتدا کی۔ اور میر عالم بہادر کے حق میں اپنا پورا زور صرف کر دیا برٹش ریزیڈنٹ مسٹر رسل لکھتا ہے کہ

۱۸۰۴ء میں اعظم الامرا کے انتقال کے بعد ہمنے نظام پر میر عالم کو مسلط

کردیا۔

---

[1] تاریخ گلزار آصفیہ صفحہ ۲۷۸

لیکن اسی رسل نے اپنے ۲۴ نومبر ۱۸۱۹ء کے ایک مراسلہ میں میر عالم کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے۔

"بلا شک وہ پبلک معاملات میں بڑی قابلیتوں کا مالک تھا، مگر دل کی ان خوبیوں سے قطعاً عاری تھا جو اعلیٰ دماغی قوتوں کی کمی کو پورا کرتی ہیں، وہ حریص، بے حس کینہ پرور، اور سنگدل تھا۔ اس نے نہ کسی احسان کو یاد رکھا اور نہ کسی قصور کو بھلایا اگرچہ وہ سخاوت کے اظہار کا شوقین، اور ہر دلعزیزی کا طلبگار تھا، مگر اس کے دل میں اپنے ابنائے نوع کے لئے نہ منفرداً، نہ مجتمعاً، کوئی جذبہ ہمدردی نہ تھا۔ اس کے احوال اور اس کی قابلیتوں نے اس کو اپنی حکومت کے لئے عمدہ کام کرنے کی اتنی قدرت بہم پہنچائی تھی جتنی اس حکومت کے کسی ملازم کو کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ مگر اس نے بہت سی خرابیوں کو بڑھا دیا، اور کسی ایک کو بھی کم نہ کیا۔ ...... اس کا دور حکومت زیادہ تر نظام سے اقتدار چھیننے میں گذر گیا"[1]

یہ اس دیوان کی خصوصیات تھیں جس کو انگریزی حکومت اپنی اغراض کے لئے حیدر آباد کے منصب وزارت کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھتی تھی۔ مگر انگریزوں کی خوش قسمتی سے معاملات صرف یہیں تک نہیں رہے۔ بلکہ انہیں اپنا اثر بڑھانے کے لئے اس کے بعد بھی مواقع ملتے چلے گئے۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں میر عالم نے مہاراجہ چندو لال کو اپنا پیشکار بنایا۔ سنہ ۱۸۰۸ء میں میر عالم کا بھی انتقال ہو گیا اور منصب وزارت کے لئے دو امیدوار آگے بڑھے۔ ایک شمس الامرا امیر کبیر دوسرے منیر الملک جو میر عالم کے داماد تھے۔ لارڈ منٹو نے شمس الامرا کی سفارش

۱؎ Hydrabad Affairs Vol. II. P. 84

کی[۱] مگر منیرالملک نے مہاراجہ چندولال سے بحلف شرعی عہد کیا کہ اگر انہیں دیوانی
ملجائے تو وہ تمام اختیارات مہاراجہ کے سپرد کر دینگے۔ اور خود کسی معاملہ سے
سروکار نہ رکھیں گے[۲] خود انگریزی سلطنت نے بھی منیرالملک کے تقرر کو اس شرط
کے ساتھ منظور کر لیا کہ وہ تمام اختیارات مہاراجہ چندولال کو دیدیں۔ چنانچہ اسی
کے موافق عمل درآمد ہوا۔ اور مہاراجہ کو سیاہ سپید کے اختیارات مل گئے۔ جنہیں
وہ ۱۸۴۳ء تک پوری مطلق العنانی کے ساتھ استعمال کرتے رہے۔

اس زمانہ سے ریاست کے مصائب کا ایک ایسا المناک اور ماتم انگیز دور
شروع ہوا جس سے اس کا زندہ اور سلامت بچکر نکل آنا معجزہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں
اس دور مصائب کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ مختصر یہ
ہے کہ اس دور کی تین نمایاں خصوصیات تھیں۔ ایک یہ کہ ریاست کے اندرونی
معاملات میں انگریزی حکومت کو مداخلت کا پورا موقع دیا گیا۔ اور انگریزی ریزیڈنٹ
کی خواہشات پر ریاست کے مفاد کو قربان کر دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ریاست
کے انتظام کو نااہل لوگوں پر چھوڑا گیا۔ اور ذمہ دار عہدوں کے لئے اہلیت کا
معیار قابلیت کو نہیں بلکہ نذرانوں اور شخصی تعلقات کو قرار دیا گیا۔ تیسرے یہ کہ
مداخل و مخارج کا توازن باقی نہ رہا۔ اور قرض لے لیکر خسارہ کو پورا کرنا ریاست
کی مالی پالیسی کا ایک مستقل جزو بن گیا۔ حیدرآباد میں ایک انگریز ولیم پامر نے ساہوکارہ

۱؎ اس وقت شمس الامرا حیدرآباد کے اکابر میں سب سے زیادہ یورپین تہذیب کی طرف مائل تھے
اسی لئے گورنر جنرل کی نظر اُن پر پڑی۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انگریزی اغراض کے لئے
منیرالملک سب سے زیادہ مفید تھے۔ ۲؎ تاریخ رشیدالدین خانی ص۹۹

کی دوکان کھول رکھی تھی جس سے ریزیڈنسی کا گہرا تعلق تھا اس سے ۲۴ فیصدی تک کی بھاری شرح سود پر رقمیں لی جاتیں۔ اور انہیں دریا دلی کے ساتھ خرچ کیا جاتا تھا۔ اس طرح ۱۸۲۳ء تک ریاست ایک کرور ۱۹ لاکھ روپیہ کی قرضدار ہوگئی۔ جسے بیباک نے کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ شمالی سرکار کا پیشکش (۷ لاکھ روپیہ سالانہ) انگریزی حکومت کو ہمیشہ کے لئے معاف کیا گیا اور اس کے عوض یہ قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کے بعد دوسرے مہاجنوں سے رقمیں قرض لی جاتی رہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے نواب سکندر جاہ نے اپنی زندگی میں ریاست کو ایک کرور روپیہ دیا اور ان کے بعد نواب ناصر الدولہ نے ۸۰ لاکھ روپیہ اپنے پاس سے دیا[1] لیکن اسکے باوجود ریاست کی قرضداری کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۳ء میں مہاراجہ چندولال نے استعفا دیا تو جنرل فریزر کے بیان کے مطابق تمام قرضوں کو ادا کرنے کے لئے ریاست کو دو کرور روپیہ کی ضرورت تھی اس کے علاوہ بہت سے ایسے ناجائز مصارف کا بار ریاست کے خزانہ پر پڑا ہوا تھا۔ جن کی بدولت آخر ملک کا ایک قیمتی حصہ ریاست کو دینا پڑا۔

سیاسی مرتبہ میں کمی

اس بدانتظامی اور کمزوری کا راست نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کے سیاسی مرتبہ کو سخت نقصان پہنچا۔ انگریزی حکومت کا اصول تو یہ ہے کہ "طاقتور کے سامنے سبک سری اور کمزور کے سامنے سرگرانی"۔ جب تک نواب غفران ماب میر

[1] رشید الدین خانی ص۱۵ و ص۲۶

نظام علی خاں کے عہد میں ریاست کی بنیاد مضبوط تھی، انگریزی حکومت ان کی شاہانہ خود مختاری کا پورا احترام ملحوظ رکھتی تھی۔ اور ان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے سے کامل اجتناب کرتی تھی۔ سفارتی تعلقات میں دونوں سلطنتوں کے درمیان کامل مساوات تھی۔ بلکہ ایک باجگذار حکومت ہونے کی حیثیت سے انگریزی حکومت کے لئے ایسے آداب مقرر تھے، جو کمتر درجہ کے حلیف کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ لیکن نواب غفران مآب کی آنکھ بند ہوتے ہی جب ریاست کو گھن لگنا شروع ہوا۔ اور اس کی اندرونی طاقت مضمحل ہونے لگی۔ تو انگریزی حکومت کا رویہ بھی بدلنے لگا۔

غفران مآب کے عہد تک دونوں سلطنتوں میں برابر کے سفارتی تعلقات تھے۔ حیدرآباد میں ریزیڈنٹ اور کلکتہ میں ایلچی رہتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۰۳ء میں جب میرزا عبداللطیف کی جگہ یاورالدولہ کو ایلچی بنا کر بھیجا گیا تو گورنر جنرل نے انکو ناپسند کیا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہ واپس بھیجدیئے گئے۔ ان کے بعد پھر سفارت موقوف ہوئی۔ اور حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کے اندر دونوں عہدے جمع ہوگئے۔

غفران مآب کے عہد تک ریزیڈنٹ کو ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مگر ان کے بعد نواب سکندر جاہ کے عہد میں پہلے دیوان و پیش کار کے تقرر کے مسئلہ میں ریزیڈنٹ نے علانیہ مداخلت کی پھر رفتہ رفتہ ملک کے انتظامی معاملات میں اس کا دخل بڑھتا رہا۔ یہانتک کہ مالگذاری کے بندوبست اور عہدہ داروں کے تقرر تک میں ریزیڈنٹ کا حکم

بالاتر رہنے لگا۔ اور بادشاہ کے خلاف خود اس کے ملازموں کی پشتیبانی کرنا انگریزی حکومت کی پالیسی کا مستقل جزو بن گیا۔ حد یہ ہے کہ نظام سے یہاں تک کہدیا گیا کہ۔

"تمہارا چندو لال کی علیحدگی سے دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا...... اگر ہز ہائی نس کے معاملات کا انصرام کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر برٹش گورنمنٹ بھروسہ نہ کرسکتی ہو۔ تو ممکن ہو کہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ ناگزیر ہو جائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگہبانی کسی دوسرے ڈھنگ سے کرے، بجائے اُس طریقہ کے جو اب تک کافی پایا گیا ہے"[۱]

اس سے ریاست میں جو ابتری پھیلی۔ اس کا بیان خود انگریزی ریزیڈنٹ کرنل اسٹوارٹ (Col. Stewart) کی زبان سے سننا چاہیئے۔ جو اس نے ۱۸۳۰ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا۔

"جو لوگ اس دربار میں ۳۰ سال سے ہماری پالیسی کو دیکھ رہے ہیں، جنھوں نے دیکھا ہے کہ ہم کس طرح خود اپنے بنائے ہوئے آدمیوں کو وزارت دلواتے ہیں اور خود ان کے بادشاہ کے خلاف ان کی حمایت کرتے ہیں۔ کس طرح ہم نے کارآمد فوج پر قابو حاصل کرلیا ہے۔ اور کس طرح ہم ملک کے دیوانی انتظام پر حاوی ہو گئے ہیں، وہ اس حقیقت میں مشکل سے کوئی شک کرسکتے ہیں، اور سب سے کم خود نظام کو اس میں کوئی شک ہوسکتا ہے، کہ ہم نے اپنے آپ کو اس ملک کا واقعی حکمراں سمجھ لیا ہے۔ بہت سی خرابیاں جو ریاست میں موجود ہیں،

---

[۱] Memoirs of Fraser P. 358

بلاریب ہماری بے ضابطہ مداخلت کے ناگزیر نتائج ہیں، اس لئے یہ بات مشکل ہی درست ہوسکتی ہو کہ نظام اور ان کے دیوان کو جس حال میں وہ آج کل ہیں، ان خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جائے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان کو درست کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ درحقیقت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم خود ان خرابیوں کے ذمہ دار قرار دئیے جائیں، کیونکہ انہیں دفع کرنے کی قدرت ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔"

اس قسم کا اعتراف سر چارلس مٹکاف نے بھی کیا ہے۔ جو برطانیہ کی سرکاری کتاب (Blue Book) میں شائع ہوچکا ہے۔[1]

نواب سکندر جاہ کے زمانہ تک ظاہری ادب آداب بدستور باقی تھے گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری مراسلات میں "نیازمند" لکھتا تھا، اور نظام اپنے لئے "مابدولت" کا لفظ استعمال کرتے تھے ۱۸۲۹ء میں جب انکا انتقال ہوا۔ اور نواب ناصر الدولہ ان کی جگہ مسندنشین ہوئے تو ان کے ساتھ مساویانہ خط وکتابت شروع ہوگئی۔ میر عالم کے زمانہ میں دیوان ریاست سے گورنر جنرل کی خط وکتابت برابر کے دوستوں کی سی ہوتی تھی۔ مگر ۱۸۴۶ء میں جب سراج الملک نے دیوانی کے عہدہ پر سرفراز ہوکر انہی آداب والقاب کو استعمال کیا تو گورنمنٹ کیطرف سے صاف لکھدیا گیا کہ۔

"ہندوستان کے حالات اب اسوقت سے بہت بدل چکے ہیں، جبکہ ان کے پیش رو میر عالم کو یہ القاب۔ ۴۰ برس پیشتر لکھے گئے تھے جنہیں اب مثال کے طور پر پیش کیا

---

[1] Memoirs P. 86

جاتا ہے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل اور حیدرآباد کے دیوان کی اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے اب یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ برٹش گورنمنٹ کے نمائندے کو اس طریقہ سے خطاب کیا جائے، جو ایک زیر حمایت اور امداد پانیوالی ریاست کے وزیر کے ساتھ مساوات کو پہونچتا ہوگا[۵۱]

اس کے بعد رفتہ رفتہ ریزیڈنٹ نے بھی ادب آداب کو رخصت کرنا شروع کیا۔ نواب ناصر الدولہ کے ابتدائی زمانہ میں جنرل فریزر شکایت کرتا ہے کہ یہاں کے آداب بہت تکلیف دہ ہیں[۵۲]۔ مگر انہی کے آخری زمانہ میں جب کرنل لو، ریزیڈنٹ[۵۳] ہوکر جاتا ہے۔ تو وہ دربار میں نہایت گستاخانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ صاحب تاریخ رشید الدین خانی لکھتا ہے کہ۔

"چونکہ جان لو صاحب نے دربار گذشتہ و حال میں مثل سفیران سابق کے لحاظ اور آداب حضور کا نشست و برخاست اور کلام میں نہ کیا، اکثر گستاخانہ اور ریا کا کلمات سے پیش آئے اس سے خود بدولت اپنے نزدیک چندے بہت آزردہ خاطر رہے، اور خلجان دلپر ملال گذرا (صفحہ ۴۳۷ و ۳۹)

نواب افضل الدولہ بہادر کے زمانہ تک بھی بہت کچھ پرانے نیازمندانہ آداب کی پابندی باقی تھی، لیکن نواب میر محبوب علیخاں مرحوم کی کمسنی کے زمانہ سے انہیں

---

۵۱ Memoirs P. 217

۵۲ فریزر لکھتا ہے کہ نظام سے ملاقات بہت مراسم اور تکلفات کیساتھ ہوتی ہے، اور ریزیڈنٹ سے ایسے مواقع پر جن آداب کی پابندی کرائی جاتی ہے وہ اس دربار کیساتھ ہمارے ابتدائی تعلقات کے زمانہ سے برابر چلے آرہے ہیں، اور کچھ ایسی نوعیت کے ہیں کہ میں انکو حکومت عالیہ اور دیسی ریاستوں کی خود اعتباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے ریزیڈنٹ کی نمائندہ پوزیشن کے مناسب حال نہیں دیکھتا (میموائرز آف فریزر صفحہ ۱۹۳)۔

کمی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب ریزیڈنٹ ان تمام درباری آداب سے مستثنیٰ ہو چکا ہے، جو ریاست میں رائج ہیں۔

لیکن اس دور انحطاط میں سب سے زیادہ ریاست کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی اصلی المناک داستان کچھ دوسری ہے جسکو اختصار کے ساتھ آگے بیان کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کنٹنجنٹ کا قیام

سنہ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۵ کے مطابق جمعیت نقلبندی کے فرائض یہ مقرر کئے گئے تھے، کہ وہ ان لوگوں کی سرکوبی کرے گی۔ جو سرکار نظام کے جائز مطالبات ادا کرنے سے گریز کریں گے۔ یا سرکار کے ممالک محروسہ میں بدامنی پھیلائیں گے۔ لیکن اس معاہدہ کے گیارہ ہی مہینے بعد جب شوراپور کے زمیندار نے خراج دینے سے انکار کیا تو۔ تو کمپنی نے فوج بھیجنے میں بہت حیل حجت کی اور ۸ مہینہ بعد اسے بھیجا بھی تو ایسی شرائط پر جو خلاف معاہدہ تھیں۔ اس کے بعد پہلی جنگ مرہٹہ پیش آئی جس میں نظام نے معاہدہ کے مطابق ایک زبردست فوج سے کمپنی کی مدد کی، اور اس نے بہت مفید خدمات انجام دیں۔ لیکن اس فوج میں بہت سے عیوب نکالے گئے۔ اور کہا گیا کہ اس نے کچھ کام نہیں کیا[۱]۔ ان چالوں کا مقصد یہ تھا کہ نظام کو ایک اور فوج خود انہی کے خرچ پر رکھنے کی صلاح دی جائے۔ چنانچہ سنہ۱۸۱۳ء میں گورنر جنرل نے نظام سے اصرار کیا[۲] وہ ایک نئی فوج کمپنی کے زیر انتظام قائم کریں جس کا کام سرکش زمینداروں اور باغیوں کی

---

[۱] تاریخ رشیدالدین خانی صفحہ۱۶۰ و صفحہ۱۶۱۔

سرکوبی کرنا ہو۔ یہ بالکل وہی خدمت تھی جسکو انجام دینے کے لئے ۴۰ لاکھ کا ملک دیکر نظام نے جمعیت تغلبندی قائم کرائی تھی۔ اس لئے انہوں نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ کمپنی کی حکومت نے اسپر یہانتک زور دیا کہ اتحاد کو منسوخ کرنے کی دہمکی دیدی اور نظام کو ڈرایا کہ اگر اتحاد منسوخ ہوگیا تو آپ کی ریاست کمپنی کے مقبوضات سے ملحق کرلی جائے گی[۱] مگر جب ان دہمکیوں سے بہی کام نہ چلا تو ۱۸۱۳ء میں ہنری رسل ریزیڈنٹ اور مہاراجہ چندولال پیشکار نے باہمی اتفاق سے دو ہزار سواروں کی ایک فوج قائم کرلی جس کا نام رسل بریگیڈ رکھا گیا[۲] بعد میں بڑہاتے بڑہاتے اس کو چہار چند کردیا گیا۔ اسکے اخراجات کے لئے تقریباً ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا بار ریاست کے خزانہ پر ڈالا گیا۔ اور یہی فوج حیدرآباد کنٹنجنٹ بن گئی۔ اس فوج کے قیام کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ چونکہ جمعیت تغلبندی کمپنی کے زیر اثر ہے، اور ضرورت کے وقت اسکی خدمات فوراً حاصل نہیں کی جاسکتیں اس لئے ایک باضابطہ فوج خود ریاست کے زیر حکم رہنی چاہئے۔ تاکہ اس سے فوراً کام لیا جاسکے۔ لیکن یہ محض ایک دہوکہ تہا۔ دراصل یہ فوج بالکل ریزیڈنٹ کے ماتحت تھی، ریاست کو اسپر مطلق اختیار نہ تہا۔ ریزیڈنٹ ہی اس کا افسر اعلیٰ تہا، اسی کو عزل و نصب کا اختیار تھا۔ اسی کی اجازت پر اس کی نقل و حرکت منحصر تھی، اور اسکے حکم کے بغیر کنٹنجنٹ کے ایک سپاہی سے بہی ریاست کی کوئی خدمت نہیں لی جاسکتی تہی۔

یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس کنٹنجنٹ کا قیام نظام کی اجازت کے بغیر عمل میں

---

۱. Wellingtons despatches. Jan. 19, 1805

۲. تاریخ رشید الدین خانی صفحہ ۱۲۱۔

آیا۔ اور نظام کی مرضی کے خلاف اسکو قائم رکھا گیا ہے۔ ریکارڈ پر کافی ثبوت موجود ہے۔ لارڈ مٹکاف نے اپنی ۱۱ر مارچ ۱۸۳۲ء کی یادداشت میں صاف لکھا ہے کہ

"کنٹنجنٹ فورس درحقیقت ہمارے اور راجہ چندو لال کے درمیان ایک مشترک کاروبار ہے"۔[۵۱]

سر فریڈرک کری جو لارڈ ڈلہوزی کی کونسل کا ایک رکن تھا ۱۲ر اپریل ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ۔

"کنٹنجنٹ دراصل مسٹر رسل ریزیڈنٹ اور اس زمانہ کے وزیر چندو لال کی باہمی بخت وپز کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ اور جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں اس انتظام کے لئے نظام اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی جانب سے کوئی رسمی منظوری ریکارڈ پر موجود نہیں ہے"۔[۵۲]

۱۸۲۶ء میں جب کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے نواب سکندر جاہ کے ذاتی خزانہ سے روپیہ مانگا گیا تو انہوں نے اسکے دینے سے صاف انکار کر دیا۔[۵۳] ۱۸۳۳ء میں نواب ناصر الدولہ نے کنٹنجنٹ کے بقا کی سختی کے ساتھ مخالفت کی۔[۵۴] ۱۸۴۳ء میں انہوں نے کرنل اسٹیوارٹ ریزیڈنٹ سے باصرار کہا کہ جس طرح میرے دیوانی

---

۵۱ Hydarabad Affairs Vol. II. P. 247

۵۲ " " " P. 623

۵۳ " " " P. 374

۵۴ Memoirs P. 165

انتظام سے انگریز افسر ہٹالئے گئے ہیں اسی طرح میری فوج سے بھی ان کو ہٹالیا جائے میری فوج کو اب کنٹنجنٹ کی حاجت نہیں ہے[۵۱]۔ جنرل فریزر ریزیڈنٹ اپنے ۲۶ جولائی سنہ ۱۸۴۳ء کے مراسلہ میں حکومت ہند کو اطلاع دیتا ہے کہ۔

اگر نظام کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیا گیا کہ وہ فی الواقع خود مختار ہیں تو پہلا کام جو وہ کریں گے وہ یہ ہوگا کہ کنٹنجنٹ کی برطرفی کا مطالبہ کریں گے جس سے ان کی ناراضی معلوم ہے۔ اور جس کے قیام اور دائمی بقا کے لئے کسی موجود الوقت معاہدہ میں کوئی شرط موجود نہیں ہے[۵۲]"

سنہ ۱۸۵۳ء میں جب معاہدۂ تفویض برار کے لئے برطانی ریزیڈنٹ کرنل لو نواب ناصر الدولہ سے گفت و شنید کر رہا تھا۔ تو نواب ناصر الدولہ نے پھر اس امر واقعہ کا اعادہ کیا کہ کنٹنجنٹ کا قیام نواب سکندر جاہ کی اجازت کے بغیر عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آخری جنگ مرہٹہ (سنہ ۱۸۱۸ء) کے بعد کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس میں ہماری مدد کی ضرورت ہوتی۔ کرنل لو نے جواب دیا کہ یہ فوج آپ کے والد صاحب کی اجازت سے قائم کی گئی ہے۔ نواب نے فرمایا کہ "میرے والد کا نام نہ لو، یہ کہو کہ مہاراجہ کی اجازت سے قائم کی گئی[۵۳]"۔ نواب ناصر الدولہ کے اس استدلال کے جواب میں کرنل لو، اور خود لارڈ ڈلہوزی نے اسوقت یہ دلیل پیش کی تھی کہ جب نواب سکندر جاہ نے مہاراجہ چندولال کو مختار کل بنا دیا تھا تو مہاراجہ

---

۵۱ Memoirs P. 90

۵۲ Hydarabad Affairs Vol. II. P. 375

۵۳ Hydarabad Affairs Vol. II. P. 576

کی منظوری خود نواب کی منظوری تھی لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ سر چارلس مٹکاف جیسا مستند اور معتبر شخص جو نواب سکندر جاہ کے زمانہ میں پانچ سال تک سلطنت برطانیہ کا ریزیڈنٹ رہ چکا ہے۔ بالفاظ صریح اس کا اعتراف کرتا ہے کہ انگریزی حکومت نے زبردستی نواب سکندر جاہ کو بے اختیار کیا۔ اور ان کی مرضی کے خلاف ان کے وزرا کو استعمال کرتی رہی۔ ۲۴؍ اگست ۱۸۲۹ء کی ایک تحریر میں یہ نامور برطانی مدبر لکھتا ہے۔

سنہ ۱۸۰۰ء کے عہدنامہ کے بعد ہی سے یہ ضروری سمجھ لیا گیا تھا کہ ریاست کا وزیر ہمارے مفید مطلب ہونا چاہیئے۔ اور ہمیں اپنے اثر سے اس کی تائید کرنی چاہیئے۔ ...... ہمارے ریزیڈنٹ نے ہز ہائی نس (نواب سکندر جاہ) کو ان کی تخت نشینی کے وقت اپنا مقصد صاف بتا دیا تھا ...... چنانچہ ارسطو جاہ مرتے دم تک وزیر رہے۔ اور اس تمام مدت میں انہوں نے اپنے آقا یعنی نظام حال کو بے وقعت، حلقہ بگوش اور محروم الاقتدار رکھا۔ وزیر کی وفات پر نظام نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ معاملات سلطنت کو خود انجام دینا چاہتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پھر کوئی مطلق العنان وزیر ان پر مسلط کیا جائے مگر جو انتظام وہ چاہتے تھے اس پر ہماری گورنمنٹ کو اعتراض تھا ہم نے اصرار کیا کہ ایک وزیر کامل اختیارات کے ساتھ مقرر کیا جائے۔ ہم نے اپنا حق جتایا کہ وزیر ہمارے مفاد سے وابستہ اور ہمارا منتخب کردہ ہونا چاہیئے۔ اور اگر ضرورت ہو تو ہمیں اس کے تقرر پر زور دینا چاہیئے۔ مگر انتہائی کارروائی کی ضرورت پیش نہیں آئی

"میر عالم جنکو ہمنے منتخب کیا تہا۔ وزیر مقرر کر دیئے گئے۔ اور مرتے دم تک اپنے آقا کی مملکت کے بلا شرکت احد سے حکمراں رہے۔ نظام نے خود اپنی سلطنت میں اختیارات کا کچھ حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر یہ وزیر کو گوارا نہ تہا۔ اور ریزیڈنٹ اس کی مدد پر تہا۔ آخر نظام شکستہ خاطر ہوکر دست کش ہوگئے۔ اور اسوقت سے انہوں نے سلطنت کے معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ گوشۂ عزلت میں افسردہ وغمگین زندگی بسر کرتے رہے۔ اس طرح ہمارے اثر نے حیدرآباد کے وزیر کو اس کے اپنے آقا کی مرضی کے خلاف مطلق العنان حکمران بنادیا۔ برطانی مفادوں کے تمام معاملات میں وہ برطانی ریزیڈنٹ کا تابع فرمان تہا...... اس کی مخالفت کو ہمارے خلاف دشمنی اور انگریزی سلطنت کے ساتھہ بیوفائی سے تعبیر کیا جاتا تہا۔"

"میر عالم کے انتقال کے بعد نظام نے دوبارہ اپنے امور سلطنت کو اپنے ہاتھہ میں لینا چاہا مگر بے نتیجہ۔ ان کو ایک وزیر مقرر کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اور یہ غیر معمولی انتظام عمل میں آیا کہ نظام کے منتخب کردہ شخص منیرالملک کو عہدۂ وزارت دیا گیا۔ مگر یہ شرط کرلی گئی کہ ریاست میں ان کے اختیارات کچھہ نہ ہوں گے۔ تمام اختیارات نائب وزیر چندولال کو دئے گئے۔ جو ہمارے زیر اثر تھے۔ چنانچہ اسوقت سے ہماری مداخلت کی بدولت رئیس وقت خود اپنی سلطنت کے معاملات سے الگ کردیا گیا، وزیر اعظم بھی اسی طرح الگ بٹھادیا گیا، اور حقیقی وزیر کامل طور پر ہمارا تابع فرمان ہوگیا.......!"

"اپنے اثر اور عمل دخل کو بڑھانے کے سلسلہ میں ہمارا دوسرا قدم یہ تہا کہ ہمنے نظام کی فوج ہٹاکر اس کی جگہ خود اپنی فوج کو رکہنا شروع کردیا جو برطانی افسروں

کے ماتحت قائم کی گئی تھی .... ہم نے اس کی عمومی نگرانی اور تنظیم سے ابتدا کی۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ اب نظام کے خزانہ سے ۴۰ لاکھ سے اوپر رقم ایک ایسی فوج پر خرچ ہوتی ہے۔ جو کلیتہً برطانی افسروں کے زیر قیادت ہے اور جس پر برطانی ریزیڈنٹ کو بلاشرکت احدے کلی اختیارات حاصل ہیں۔ یہ انتظام صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وزیر ہمارا بالکل تابعدار ہے۔ کیونکہ اس کارروائی کو دربار اور قومی فوج کے افسروں کے لئے قدرتی طور پر سخت ناگوار خاطر ہونا چاہیے۔"[1]

۱۴ اگست ۱۸۲۶ء کی ایک اور تحریر میں مٹکاف لکھتا ہے۔

"نظام نے اپنے شاہی حقوق کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوشش کی۔ اس کو زبردستی دبا دیا گیا۔ رئیس وقت خود اپنی مملکت میں محض ایک سرکاری وظیفہ خوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا دماغ غالباً فطری طور پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے ناقابل نہیں ہے۔ مگر ممکن ہے کہ طویل عرصہ تک افسردہ اور گوشہ نشین زندگی بسر کرنے کے باعث متاثر ہو گیا ہو .... میں اُس رئیس کی حالت سے زیادہ قابل رحم اور اس سے زیادہ ناقابل الزام حالت کا تصور نہیں کر سکتا جسے اس طرح خود اپنے ملازم کا ماتحت بنا دیا گیا ہو، اور ایک خارجی طاقت اس ملازم کی حامی بن گئی ہو۔ نظام کے ممالک محروسہ میں اس قسم کی فوج (یعنی کنٹنجنٹ) کا ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا، اور خود نظام کے خرچ پر نظام کے دبانے کا ذریعہ بننا حیدرآباد کے وزیر کی تابعداری ہی کی بدولت ممکن ہوا ہے۔"[2]

یہ کسی اور کے نہیں خود برطانی حکومت کے ایک سابق ریزیڈنٹ کے

---

[1] Hydarabad Affairs Vol. 11. P. 299-300
[2] " " P. 375

اعتراضات ہیں جن سے اس امر کا نا قابل تردید ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ حیدرآباد کنٹنجنٹ نواب مغفرت منزل سکندر جاہ بہادر کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی۔ اور معاہدات کے بالکل خلاف ریاست پر یہ بار محض ایک پیشکار کی رضامندی سے ڈالدیا گیا جسے خود انگریزی حکومت نے، نہ کہ ملک کے جائز حکمراں نے، ریاست کا مختار کل بنادیا تھا۔

کنٹنجنٹ کی اصلیت

اب رہا یہ سوال کہ اس فوج کے قیام کا اصلی مقصد کیا تھا، اور وہ کہاں تک جائز بنیاد پر رکھی گئی تھی۔ سو اسکے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ کہے بغیر میں خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے بیانات یہاں نقل کرتا ہوں۔

۲۴ راپریل ۱۸۴۸ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائرکٹر سر جیمس لوشنگٹن نے حیدرآباد کے منصرم ریزیڈنٹ کرنل لو کو ایک طویل خط لکھا تھا جسمیں وہ لکھتا ہے کہ۔

"میں کچھ عرصہ سے یہ رائے رکھتا ہوں کہ بڑی حد تک ہم خود نظام کی مالی مشکلات کے باعث ہیں ہم نے نظام پر ایسے مطالبات کا بار ڈالدیا ہے جن کے ہم کسی معاہدہ کی روسے مستحق نہیں ہیں۔ ۱۲ راکتوبر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارہویں دفعہ کی روسے نظام نے اپنے اوپر اس بات کا ذمہ لیا تہا کہ جنگ کے موقع پر وہ ۶ ہزار پیدل اور ۹ ہزار سوار دیں گے، جس کو کنٹنجنٹ فورس کا نام دیا گیا تہا، یہ فوج ریزیڈنٹ کی درخواست پر ۱۸۰۳ء میں مہیا کی گئی، اور اس نے مرہٹوں کے خلاف جنگ میں عمدہ خدمات انجام دیں مگر دوسرے سال جو فوج مہیا کی گئی وہ تعداد اور اہلیت کے لحاظ

سے اتنی ادنی تھی کہ ریزیڈنٹ کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ نظام کی ملازمت میں برطانی افسروں کے ماتحت ایک باقاعدہ رسالہ قائم کیا جائے بعد ۱۸۰۸ء میں اصلاح کا ایک خاکہ منظور کیا گیا۔ اور اس پر عمل درآمد ہوا۔ پھر ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۶ء میں مزید اصلاحات کی گئیں، یہاں تک ۱۸۴۶ء کی کیفیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ کنٹنجنٹ میں ۲۹۲۵ سوار، ۵۳۶۸ پیدل اور ۹۵ یورپین افسر ہیں جن کا نظام کی حکومت پر ۴۲ لاکھ روپیہ (مالی) سالانہ خرچ ڈالدیا گیا ہے۔ یہ مطالبہ ریاست کی کل آمدنی کا ۱/۴ حصہ ہضم کرجاتا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نظام اسوقت ان رقوم کے قرضدار ہیں جو برٹش گورنمنٹ نے کنٹنجنٹ کے مصارف کے لئے ان کو قرض دی ہیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں یقیناً یہ رائے رکھتا ہوں کہ کنٹنجنٹ کی برطرفی پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نہ اس کا ابتدائی قیام کسی معاہدہ پر مبنی ہے اور نہ استمراری بقا"[۵۱]

اس کے جواب میں کرنل لو[۵۲] نے ۲۴ر جون ۱۸۴۷ء کو ایک خط لکھا، جسکے بعض خاص حصے یہ ہیں۔

"میں نے ۱۸۳۳ء میں لارڈ آک لینڈ کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر کالون کو جو نیم سرکاری خط لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں اس جرم بیرحمی کے متعلق آپ کی رائے سے کسقدر متفق ہوں۔ جس کا ارتکاب ۴۴ سال سے حکومت

---

۵۱ Memoirs. P. 247

۵۲ یہ وہی کرنل لو ہے جو ۱۸۵۳ء میں حیدرآباد کا ریزیڈنٹ بنایا گیا، اور جس نے نظام پر فوجی قوت کا دباؤ ڈالکر تفویض برار کے عہدنامہ پر دستخط حاصل کئے۔

نظام کے ساتھ، ان کی آمدنی پر کنٹنجنٹ کی تنخواہ کے لئے ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ
کا خرچ عائد کرنے کی صورت میں کر رہے ہیں، جو دوسرے الفاظ میں خود ہماری
ہی اغراض کے لئے ہے، نہ کہ نظام کی اغراض کے لئے۔ ۱۸۱۹ء سے دکن میں
کامل امن ہے، اور چونکہ ہم صرف حالت جنگ میں نظام کی فوج سے ۶ ہزار
پیدل اور ۹ ہزار سوار مانگنے کا حق رکھتے ہیں، اس لئے از روئے معاہدہ ہم کو
اس پوری مدت یعنی ۲۰ برس سے زیادہ کی مدت میں کنٹنجنٹ کیلئے نظام سے ایک روپیہ بھی مانگنے
کا حق نہ تھا۔ مگر اس مدت میں ہم نے نظام کے خزانہ سے (ماسوا اس ۴۲ لاکھ کے جو اب
کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں قرض کے طور پر نظام کے ذمہ واجب الادا ہی) ۱۱ کرور ۲۰ لاکھ حالی
کی رقم خطیر کھینچ لی ہی جسکا ایک بڑا حصہ نظام کے ممالک محروسہ سے ہمیشہ کیلئے سپاہیوں اور افسروں
کی ترسیل زر و پس انداز کی صورت میں باہر چلا گیا ہی۔ کیونکہ ان سپاہیوں اور
افسروں کا ۳/۴ حصہ اودھ، روہیلکھنڈ اور دوسرے قطاع ہند سے آیا ہوا ہے جو
اپنے بچائے ہوئے روپے کو زر نقد کی صورت میں دور دراز علاقوں کو لیجاتے
ہیں، اور اس طرح یہ دولت کی نکاسی نہ صرف نظام کے خزانہ کو خالی کئے دیتی ہی
بلکہ ان کی رعایا کو بھی روز بروز مفلس بنا رہی ہے، ...... مجھے یاد ہے کہ میں
نے ۱۸۳۳ء میں مسٹر کالون کو بتایا تھا کہ ۱۸۱۹ء سے اب تک موجودہ فوج
کا نصف حصہ ۲۰ لاکھ کے خرچ پر وہی خدمات حکومت نظام کے لئے انجام دے
سکتا تھا جو موجودہ فوج ۴۰ لاکھ کے خرچ سے انجام دے رہی ہے۔ برسوں سے
کنٹنجنٹ کے ایک بڑے حصہ سے کوئی کام نہیں لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں معاہدہ
کی رو سے نظام کو کمپنی کی جمعیت نعلبندی سے ہر وہ خدمت لینے کا حق ہے

جو کنٹنجنٹ سے لی جاتی ہے، یا لیجا سکتی ہے۔ اب دیکھئے کہ اگر ۱۸۱۹ء سے صرف ۲۰ لاکھ کی فوج رکھی جاتی تو کیا ہوتا۔ بالکل ظاہر ہے کہ اب تک ہم نظام کے خزانے سے اس رقم کی بہ نسبت جو اب تک ہم نے وصول کی ہے ۵ کروڑ کم وصول کرتے۔ یہ فرق تو نظام کے حق میں ہوتا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں کیا ہوتا؟ میری رائے یہ ہے کہ کچھ نہ ہوتا۔ کیونکہ ۱۸۱۹ء سے ہم نے ایک مرتبہ بھی کنٹنجنٹ کو نظام کے حدود سے باہر استعمال نہیں کیا ہے .... اس کے بعد اس بارے میں اور کیا کہنے کی ضرورت ہو کہ یہ دیسی حکومت اپنے بھاری قرضوں اور خالی خزانہ کے باعث کیوں قریب قریب معطل سی ہو گئی ہے"؟[51]

کورٹ آف ڈائرکٹرز کا ایک دوسرا رکن سر ہنری ولاک (Willock) اپنی ۹ر نومبر ۱۸۵۱ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ۔

"نظام کی بہترین بے قاعدہ فوج کو رفتہ رفتہ ہم نے اپنی نگرانی میں ایک باقاعدہ کنٹنجنٹ کی صورت دیکر، نواب کو ان لوگوں کی خدمات سے محروم کر دیا جو ان کے ذاتی محافظ تھے۔ اور جن کی قوت پر تحصیل اور پولیس کے افسر، مالگذاری وصول کرنے اور امن قائم کرنے کے کام میں بھروسہ کر سکتے تھے اس طرح ہمنے نظام کو مجبور کر دیا کہ وہ نظم و نسق کو چلانے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لئے پٹھانوں، روہیلوں، اور عربوں کی ایک نہایت قابل اعتراض فوج بھرتی کریں"۔[52]

---

51 Memoirs P. 248-49

52 " P. 260

کورٹ کا ایک اور رکن جنرل کالفیلڈ (Caulfield) لکھتا ہے

" ہم نے نظام پر ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ کا ایک غیر ضروری خرچ ایک ایسی کنٹنجنٹ کی پرداخت کے لئے عائد کر دیا ہے، جس کی تنظیم و ترتیب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس پر ہمارے ہی افسر مقرر ہیں، اور جس کا وہی کام ہے جو معاہدہ کی رو سے جمعیۃ نظبندی کے سپرد کیا گیا تھا۔ ہم نے نظام کو جمعیت نظبندی کی خدمات سے ایسے وجوہ کی بنا پر محروم کیا ہے جن کی حمایت میں کوئی عذر نہیں پیش کیا جا سکتا۔"[۱]

کنٹنجنٹ کا بانی سر ہنری رسل لکھتا ہے۔

" یہ فوج صرف برائے نام نظام کی ملازم تھی، اس کو ہر مہینہ ریزیڈنٹ کے خزانہ سے باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اور وہ اپنے آپ کو کمپنی ہی کی فوج سمجھتی تھی، عملی اغراض کے لئے یہ فوج بھی ہمارے لئے ایسی ہی تھی، جیسی خود ہماری فوج، اور اسکو بھی ہم اپنے فوج کی طرح کام میں لا سکتے تھے۔"[۲]

سنہ ۱۸۱۶ء میں جب رسل نے اس فوج کے قیام کی تجویز پیش کی تھی تو اس وقت بھی اس نے اپنے ۲۲ جون کے مراسلہ میں صاف لکھدیا تھا کہ یہ فوج جمعیۃ نظبندی (سب سیڈیری فورس) کو اس محنت سے بچانے کے لئے مطلوب ہے جو اسے سرکش رعایا کی سرکوبی میں کرنی پڑتی ہے۔[۳] حالانکہ سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں نظام نے اسی مقصد کے لئے برٹش گورنمنٹ کو ۶۳ لاکھ کا ملک دیکر جمعیت

---

[۱] Memoirs P. 260

[۲] Hydarabad affairs Vol. II. P. 322

[۳] " " " P. 372

نعلبندی قائم کرائی تھی۔

پھر جس وقت کنٹنجنٹ کو مستقل کیا جا رہا تھا تو خود گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز نے ۱۰ نومبر ۱۸۱۹ء کی یادداشت میں یہ الفاظ لکھے تھے

"یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ فوجیں اس بادشاہ کی بہ نسبت جس کے خرچ پر وہ رکھی جا رہی ہیں، درحقیقت زیادہ تر ہماری فوجیں ہیں۔ اگرچہ ان کا خرچ نظام دیتے ہیں اور برائے نام وہ ان کی طرف منسوب ہیں۔ مگر ان کا ہمارے ذریعہ تنخواہیں پانا، اور برطانی افسروں کی قیادت میں رہنا اس بات کی توقع کی گنجایش رکھتا ہے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کسی ناچاقی کی صورت میں وہ اپنے ظاہری آقا کے مقابلہ میں ہمارا ساتھ دیں گی۔ اب کیا یہ عقل و خرد کے مطابق ہوگا، اور کیا یہ اس اعتماد کے لئے جو آنریبل کمپنی نے ہم پر کیا ہے مناسب ہوگا کہ، ہم ایسی ایک ضمانت کو انصاف کے ایک اعتقادی نکتہ پر قربان کر دیں .... یہ بالکل خلاف مقتضائے سیاست ہوگا کہ ہم ضرورت سے زیادہ تہذیب کا خیال کر کے اپنی طاقت میں اس منفعت کے اضافہ کو خواہ مخواہ چھوڑ دیں"[1]

۱۷ جنوری ۱۸۴۳ء کو کنٹنجنٹ کے انگریز افسروں کی تنخواہوں کا مطالبہ کرنے کی قانونی مشکلات بیان کرتے ہوئے انگریزی ریزیڈنٹ فریزر لکھتا ہے۔

"یہ فوج خود صبر و تحمل پر چل رہی ہے اگر اس پر فیصلہ کن اعتراضات کئے گئے تو خواہ ہم اسکو برقرار رکھنے کے لئے اصرار کرنے پر قادر ہوں، مگر ہمیں اپنے اس

---

[1] Memoirs P. 357

امرار کو موجود الوقت معاہدات کا حوالہ دیکر یا کسی ایسے سمجھوتہ کو پیش کر کے جو اس بارے میں ہمارے اور ہز ہائی نس نظام کے درمیان ہوا ہو۔ حق بجانب ثابت کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ایسی تجاویز پیش کرنی سے احتراز کیا جائے جنکو یہ دیسی ریاست یقیناً حق بجانب نہیں سمجھتی، اور جن سے ایسے مسائل اور مجوزات پیش ہونے کا امکان ہے جو خود اس فوج کے نفس وجود کے متعلق ہوں گے"۔ (میموائرز صفحہ ۹۰)

اس کے بعد فریزر نے ۱۴ جولائی ۱۸۴۲ء کو پھر لکھا ہے کہ۔

"اگر ہم نے نظام پر یہ اثر قائم ہو جانے دیا تو یہ غیر اغلب نہیں ہے کہ علاوہ دوسری خرابیوں کے، ہم کو اس بزرگ تر خرابی کا مقابلہ کرنا پڑے گا کہ ہز ہائینس کی جانب سے کنٹنجنٹ کی برطرفی کی تجویز پیش کی جائے گی جس سے ان کی ناراضی معلوم ہے، اور جس کے نہ ابتدائی قیام کے لئے کسی معاہدہ میں کوئی بنیاد موجود ہے اور نہ مسلسل برقرار رکھنے کیلئے ۱۸۳۳ء میں ہز ہائی نس نے اس فوج کے برقرار رہنے پر فلاں اعتراضات کئے تھے۔ اور اسپر جو مصارف ہو رہے ہیں وہ دیوان کی طرف سے پیہم شکایات کے موجب ہیں"۔ (میموائرز صفحہ ۱۹۵)

خود لارڈ ڈلہوزی جس نے اسی کنٹنجنٹ کی خاطر نظام سے زبردستی ملک برار حاصل کیا، اپنی ۳۰ مارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھتا ہے کہ۔

"ان وجوہ کی بنا پر میں یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ حکومت ہند کو نہ تو معاہدہ ۱۸۰۰ء کی اسپرٹ سے اور نہ الفاظ سے اس کا کوئی حق پہنچتا ہے کہ نظام سے کنٹنجنٹ کو اس کی موجودہ شکل میں

قائم رکھنے کا مطالبہ کرے۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ایک ایماندار آدمی ہونے کی حیثیت سے ریزیڈنٹ کو یہ ہدایت دینے کے لئے ہرگز راضی نہیں ہوں کہ وہ نظام کے جواب میں یہ کہے کہ کنٹنجنٹ ۱۸۱۱ء سے ابتک انکے خرچ پر اس وجہ سے رکھی گئی ہے کہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی بارہویں دفعہ کی رو سے وہ اس کے رکھنے کے پابند ہیں" ۵۱

۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء کو لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ایک پرائیویٹ خط میں جنرل فریزر کو لکھا تھا کہ۔

"گورنمنٹ آف انڈیا بار بار از روئے معاہدہ کنٹنجنٹ رکھنے کی ذمہ داری کا ذکر کرتی ہے، کیونکہ چالیس سال سے نظام نے معاہدہ ۱۸۰۰ء کی بارہویں دفعہ کی اس تعبیر کو قبول کر لیا ہے ۵۲۔ لیکن اگر نظام اس سے مکر جائیں اور از روئے معاہدہ کسی پابندی کے وجود سے انکار کردیں تو میں ایک پبلک مین کی حیثیت سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں ایمانداری کے ساتھ یہ استدلال نہیں کرسکوں گا کہ کنٹنجنٹ کو برقرار رکھنے کے لئے سابقہ عمل کے سوا کوئی اور بھی حجت موجود ہے۔ میں یہ استدلال کر سکتا ہوں اور یہی میں نے کیا ہے

---

۵۱ Memoirs P. 360

۵۲ یہ بھی غلط ہے کہ نظام نے اس تعبیر کو قبول کر لیا۔ خود جنرل فریزر (ریزیڈنٹ) نے اس خط کے میں لکھہ دیا تھا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۱ء سے پہلے نظام نے کبھی صریح الفاظ میں اس جواز کو قبول نہیں کیا۔ (دیکھو میموآئرز ص ۳۵۳)

کہ ہز ہائینس کے طرزِ عمل (یعنی خاموشی) نے معاہدہ کو یہ صورت دیدی ہے اور جب تک اسے نامنظور نہ کر دیا جائے، ان پر یہ واجب ہے کہ سیدھی طرح اس فوج کا خرچ برداشت کریں جس کو اسی تعبیر کے مطابق انہوں نے ہمیں مرتب کرنے دیا ہے۔ لیکن اگر وہ نفس معاہدہ پر قائم ہو جائیں، تو میں یہ استدلال نہیں کر سکتا۔ کہ معاہدہ کی اسپرٹ یا الفاظ کی رو سے وہ اس بنا پر حالت امن میں ۹ ہزار کی ایک گراں خرچ فوج رکھنے پر مجبور رہیں، کہ حالت جنگ میں انہوں نے ۱۵ ہزار فوج دینے کی ذمہ داری لی ہے۔"

اپنی ایک اور خفیہ تحریر میں لارڈ ڈلہوزی لکھتا ہے۔

"عہد نامہ کے تصور میں بھی یہ نہ تھا کہ نظام کو اپنی فوج سے الگ ایک فوج بھرتی کرنے اور اس کا خرچ دینے پر مجبور کیا جائے، تاکہ وہ ہر وقت زمانۂ امن اور زمانۂ جنگ میں یکساں، گورنمنٹ آف انڈیا کے تنہا تصرف میں دیدی جائے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ میں نے کہتے سنا ہے، کہ ہز ہائی نس کی اپنی فوج محض ایک "انبوہ" ہے[1]۔ اور یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں اچھی

---

[1] عجیب لطف یہ ہے کہ انہی لارڈ ڈلہوزی صاحب نے ۷ راکتوبر ۱۸۴۸ء کو اپنے ایک سرکاری مراسلہ میں لکھا تھا کہ۔

"۱۸۰۰ء کے عہد نامہ نے ہمکو ہر وقت نظام سے ۱۵ ہزار فوج طلب کرنے کا حق دیا تھا تجربہ نے جلد ہی ثابت کر دیا کہ جب کبھی یہ مطالبہ کیا گیا ہمکو ۱۵ ہزار فوج تو نہ ملی، البتہ بہت سا بیکار اور بے ضابطہ "انبوہ" مل گیا۔ پس ہم نے بالکل صحیح اور جائز طور پر عہد نامہ کو یہ معنی پہنائے کہ ہم کو کارآمد سپاہیوں کی مقررہ تعداد مہیا کی جانی چاہئے، اس لئے ہم غیر مشکوک انصاف

فوج ملنے کا اطمینان کرنے کے لئے ہم یہ مطالبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں کہ ایک کمتر تعداد کی فوج حالت امن میں ہمارے زیر نگرانی و زیر ترتیب رہے تو میں جواب دوں گا کہ معاہدہ کی دفعہ ہم کو یہ معنی پہنانے کا کوئی حق نہیں دیتی (میمو آئرز صفحہ ۴۲۲)

ان سرکاری و نیم سرکاری تحریروں کے بعد کنٹنجنٹ کی اصلیت کے متعلق ایک حرف بھی زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان تسلیم کرتے ہیں کہ کنٹنجنٹ خلاف معاہدہ قائم کی گئی۔ نظام کی اجازت کے بغیر قائم کی گئی۔ اور اپنی اغراض کے لئے قائم کی گئی جن کے لئے اس سے پہلے ۴۰ لاکھ کا ملک نظام سے لیکر سب سیڈیری فورس قائم کی گئی تھی۔

کنٹنجنٹ کے مسرفانہ مصارف

آگے چلکر اس کنٹنجنٹ کے مصارف کی خاطر نظام پر جو مصیبتیں نازل کی گئیں ان کو بیان کرنے سے پہلے یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ انگریزی حکومت ۴۰ سال تک اپنے وفادار دوست کے خزانہ سے روپیہ لیکر اس فوج پر کس بے دردی کے ساتھ خرچ کرتی رہی اس کے لئے بھی میں اپنی طرف سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰) کے ساتھ ہز ہائی نس سے یہ مطالبہ کرسکتے اور کرتے ہیں کہ وقت ضرورت سے پہلے ہی ایسی تدابیر اختیار کریں کہ ایک باضابطہ فوج فراہم کر رکھیں جس کا خرچ وہ دیں اور افسر ہمارے ہوں، اور وہ دکن کے وسطی اضلاع میں قیام امن کا کام دے۔ اس کام کے لئے ہم ۱۵ ہزار کے بجائے صرف ۸ ہزار مانگتے ہیں"۔ (میمو آئرز آف فریزر صفحہ ۳۵)

اس مراسلہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی کی سیاست کے خفیہ اور علانیہ پہلوؤں میں کس قدر عمیق فرق تھا۔

ایک نفظ کہنے کی بجائے خود انگریزی حکومت کے ذمہ دار ارکان کے اعترافات کو نقل کرونگا۔

۲۰ جولائی ۱۸۵۱ء کو کرنل لو (منصرم ریزیڈنٹ) نے حکومت نظام کی مالی مشکلات کے متعلق ایک طویل مراسلہ گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا تھا جس میں اس نے کنٹنجنٹ کے بھاری اخراجات کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا

یہ خیال کرکے اور بھی زیادہ افسوس ہوتا ہے کہ حکومت نظام کی ان شدید مالی مشکلات کا ایک معتدبہ حصہ بالواسطہ خود ہمارے اس چالیس لاکھ روپیہ سالانہ کے مطالبہ کی بدولت اسپر نازل ہوا ہے جو ہم کنٹنجنٹ فورس کے مصارف کے لئے کرتے ہیں''۔

''نظام کی کنٹنجنٹ کے متعلق ان تمام واقعات اور حالات کو بیان کرنا درحقیقت میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ مگر میں جب سے یہاں آیا ہوں، میں نے اس حکومت کی مالی پریشانیوں کو اسقدر وسیع و ہمہ گیر دیکھا ہے کہ میں گورنر جنرل باجلاس کونسل کے سامنے پیش کرنے کے لئے اپنی رائے صاف صاف ظاہر کردینا ضروری فرض سمجھتا ہوں۔ اور اسی اصول پر میں اس اظہار رائے کے ساتھ اس رپورٹ کو ختم کرتا ہوں کہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کو ایسی ایک رقم تک کم کردینے کے لئے جو حد سے ۲۰ لاکھ روپیہ (حالی) سالانہ سے زیادہ نہ ہو، ضروری کارروائی بعجلت ہونی چاہئے۔ کیونکہ پہلے خواہ کچھ صورت رہی ہو۔ مگر اب مجھے بالکل ظاہر نظر آرہا ہے کہ حیدرآباد کی حکومت وہ بھاری رقم نقد روپے کی صورت میں کسی طرح دینے کے قابل نہیں ہے جو اس فوج کو رکھنے

کے لئے مطلوب ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس پیہم زرپاشی کا سلسلہ مزید تین سال تک بھی جاری رہا تو وہ اس دارالسلطنت کی مصیبت اور انتشار میں بہت شدید اضافہ کا باعث ہوگا اور غالباً تمام نظم ونسق کے کارخانہ کو معطل کر دیگا۔[۵۱]

اس کے جواب میں ۲ راکتوبر ۱۸۴۸ء کو لارڈ ڈلہوزی کی حکومت نے کرنل لو کو لکھا کہ۔

"ہز لارڈشپ باجلاس کونسل کرنل لو سے اس بات پر متفق ہیں کہ ہم نے کنٹنجنٹ کو نظام کے مالیات پر اتنا بھاری بوجھ بنا دیا ہے جتنا اسکو نہ ہونا چاہیئے۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی رائے میں اسٹاف بلا فائدہ زائد ہے، اور تنخواہیں بھتے اور مختلف قسم کے مصارف اس سے بدرجہا زائد ہیں، جتنے ہونے چاہئیں"[۵۲]

۳۰ رمارچ ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لارڈ ڈلہوزی نے دوبارہ اس فضول خرچی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"میں اس اعتراض کے حق بجانب ہونے کو سختی کے ساتھ محسوس کرتا ہوں جو اس فوج کے بھاری خرچ پر کیا جاسکتا ہے .... یہ فوج کم نہ زیادہ اکٹھے ۵ بریگیڈیر رکھتی ہے جنکے ساتھ ہی نسبت سے بریگیڈ میجر بھی ہیں۔ حالانکہ گو الیار کنٹنجنٹ جو ہز ہائی نس (نظام) سے ایک ہزار کم آدمیوں پر مشتمل ہے۔ صرف ایک بریگیڈیر رکھتی ہے اور باقی عملہ بھی اسی تناسب سے بہت کم ہے"[۵۳]

---

۵۱ Memoirs P. 255

۵۲ " " P. 353

۵۳ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو لارڈ ریڈنگ نے اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخاں بہادر کے جواب میں جو خط لکھا (......)

اکتوبر ۱۸۴۸ء میں کرنل لو کے پیہم اصرار پر لارڈ ڈلہوزی نے اس خرچ میں کمی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

"مزید براں گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات کے لئے بالکل تیار ہیں کہ اس فوج کے اسٹاف میں بہت سی گراں خرچ اسامیوں کو تخفیف کردیں۔ اس طرح کہ جب کوئی جگہ خالی ہو یا موقع پیش آئے تو اسکو موقوف کردیں۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل نہیں سمجھتے کہ فی الحال اس سے زیادہ کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

اس کے بعد ۱۸ دسمبر ۱۸۴۹ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز کی طرف سے حکومت ہند کو یہ ہدایت کی گئی کہ۔

"اگر کنٹنجنٹ نظام کے مالیات پر اس سے زیادہ بار ڈالتی ہے جتنا اس کی اہلیت کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے تو نظام کو ایسے غیر ضروری بار سے فوراً نجات دی جانی چاہئے۔"

۴ دسمبر ۱۸۵۱ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے پھر لکھا کہ۔

"کنٹنجنٹ کی ہیئت ترکیبی اور اس کے مصارف کی عام نظر ثانی کرکے گورنمنٹ آف انڈیا کو نظام کے سامنے تخفیف مصارف کی ایک مثال پیش کرنی چاہئے جو اُنکے مالیات کے لئے اسوقت سخت ضروری ہے۔"[۱]

---

۱ Memoirs P. 356

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳) اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس فضول خرچی کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کی ذمہ داری تنہا برٹش گورنمنٹ پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ "جس فوج کا سارا انتظام برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں تھا اس کی بدانتظامی کی ذمہ داری سے برٹش گورنمنٹ کو سبکدوش قرار دینا صرف سلطنت برطانیہ کے لارڈ چیف جسٹس ہی کا کام ہوسکتا ہے کسی اور کو یہ سعادت حاصل ہونی مشکل ہے۔

لیکن ان پیہم ہدایات اور خود لارڈ ڈلہوزی کے اپنے وعدے کے باوجود ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۳ء تک کنٹنجنٹ کے خرچ میں جس قدر کمی کی گئی اس کی کیفیت ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو سکتی ہے ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء میں کنٹنجنٹ کی قوت حسب ذیل تھی۔

سال	یورپین افسر	نان کمشنڈ افسر	سوار	پیدل	توپیں	شاگرد پیشہ	خرچ کلدار روپیہ حساب سے
۱۸۴۹ء	۷۹	۹۰	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۷	۸۸۱	۳۸۴۵۰۷۶
۱۸۵۳ء	۶۹	۸۲	۲۹۱۰	۶۷۳۱	۳۷	۸۸۱	۳۸۳۰۰۰۰

اسی کے متعلق سر ہنری ولاک نے ۱۸۵۹ء میں ایک سخت اختلافی نوٹ لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ۔

"مذکورہ بالا ہدایات کے جاری ہونے کے بعد سے نظام کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ اندرونی اضطرابات سے ان کے ملک میں انتشار پھیل گیا کنٹنجنٹ کی خدمات ان کو پیش کرنے سے انکار کیا گیا حالانکہ وہ بااثر طور پر ان کو دی جاسکتی تھیں آمدنی میں مزید کمی ہوگئی۔ کنٹنجنٹ کا بوجھ زیادہ محسوس ہونے لگا۔ مگر کورٹ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ کنٹنجنٹ کے اسٹاف میں اسامیاں خالی ہوئیں۔ اور گورنر جنرل نے ان کو پھر بھر دیا .... حیدرآباد کے ریزیڈنٹ بڑے بڑے عالی پایہ افسر، سر چارلس مٹکاف، کرنل اسٹیوارٹ، جنرل فریزر، اور کرنل لو یکے بعد دیگرے باوقات مختلفہ اظہار کرتے رہے کہ ہم از روئے معاہدہ نظام کے

خزانہ پر اتنے بڑے بڑے مطالبات کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں۔ اور یہ کہ کنٹنجنٹ کے بار نے بڑی حد تک اس مالی پریشانی کو پیدا کیا ہے جو اسوقت ریاست کی طاقت کو خطرہ میں مبتلا کئے ہوئے ہے[لہ]

لیکن یہ عجیب لطف ہے کہ جو تخفیف ۱۸۴۳ء سے بلکہ صحیح یوں ہے کہ ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۳ء تک نہ ہو سکتی تھی۔ وہی تخفیف برار لینے کے بعد پہلے ہی سال ممکن ہو گئی اور ممکن بھی اس حد تک کہ جس فوج پر ۴۰ لاکھ روپے کلدار صرف ہوتے تھے اسی پر ۱۷ لاکھ اور حد سے حد ۲۴ لاکھ روپے سالانہ خرچ ہونے لگے۔ یکم جنوری ۱۸۵۴ء کو جب حیدرآباد کنٹنجنٹ کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو اس کا خرچ ۱۷ لاکھ رکھا گیا تھا اور اس کے بعد کے اخراجات کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے ہو سکتا ہے۔

سال	یورپین افسر	نان کمیشنڈ افسر	سوار	پیادہ	توپیں	شاگرد پیشہ	خرچ سالانہ
۱۸۵۵ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۲۲۶۵۲۱۸
۱۸۵۶ء	۴۹	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۲۲۷۲۰۳۲
۱۸۵۷ء	۵۰	۵۶	۲۳۰۰	۶۲۸۲	۲۴	۶۴۴	۲۳۰۲۲۷۳

اب یہ بالکل ظاہر ہے کہ جتنی تخفیف معاہدہ برار کے بعد چار سال میں کی گئی۔ اگر اتنی ہی تخفیف معاہدہ سے پہلے چار سال میں کی جاتی۔ تو کنٹنجنٹ کے خرچ میں ۶۰ لاکھ کی کمی ہو جاتی۔ اور بجائے اس کے کہ ۱۸۵۳ء میں حضور نظام پر کمپنی کا ۵۰ لاکھ روپیہ قرض ہوتا، خود نظام کے خزانہ میں ۱۰ لاکھ روپیہ الٹا بچ رہتا۔

[لہ] Memoirs. 356

ملک ہضم کرنے کی تدبیریں

اوپر کے بیانات سے یہ معلوم ہو چکا کہ اس کنٹنجنٹ کی ولادت ناجائز طور پر ہوئی تھی، اور اس کی پرورش بھی انتہا درجہ کی فضول خرچی کیساتھ کی جا رہی تھی جس کا خود انگریزی حکومت کے ارکان کو اعتراف تھا۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ انگریزی ڈپلومیسی کے اس ناجائز بچہ کو کس طرح "یار وفادار" کا ملک غصب کرنے کا ذریعہ بنایا گیا۔

مسلسل تیس پینتیس سال کی بدنظمی اور روز افزوں انحطاط کو دیکھ کر برطانی مدبرین کا دل اس ریاست کو یا کم از کم اس کے زرخیز حصوں کو ہضم کر لینے کے لئے بے اختیار ہو رہا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ آکلینڈ نے حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کرنل اسٹیوارٹ کو جو ہدایات بھیجی تھیں ان میں لکھا تھا کہ کنٹنجنٹ کے قیام و بقا کو سب سے زیادہ اہمیت دو اور ان فوجوں کے مصارف کے لئے چند مخصوص اضلاع کا قبضہ حاصل کرنے کے مناسب مواقع تلاش کرنے میں کوتاہی نہ کرو۔[۱]

۱۸۳۸ء میں جنرل فریزر کو جو ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ ریزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ اور اس نے یہاں کے حالات کا مطالعہ کر کے یہ رائے قائم کی کہ اب یہ لقمہ تر اتنا نرم ہو چکا ہے کہ اس کو آسانی کے ساتھ نگلا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے ۱۰ اپریل ۱۸۳۹ء کو لارڈ آکلینڈ کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے دوران میں وہ لکھتا ہے کہ۔

---

۱ Memoirs P. 89

"ازالۂ مرض کے لئے جزوی تدبیر کرنا میں لاحاصل سمجھتا ہوں۔ اس ملک کی حکومت کو عملاً اپنے ہاتھ میں لینے سے کم کوئی چیز میری رائے میں ان خرابیوں کا کافی علاج نہ ہوگی۔ جو یہاں پھیلی ہوئی ہیں"[۵۱]

فریزر کا خیال یہ تھا کہ کمپنی حکومت نظام کو ایک کرور روپیہ قرض دے اور اس کے عوض نہ صرف تمام ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے، بلکہ عربوں، روہیلوں اور دوسری فوجوں کو بھی منتشر کر دے۔ لیکن اس وقت ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا کوئی موقع نہ تھا۔

اس کے بعد فروری ۱۸۴۳ء میں اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کیپٹن میلکم اور مہاراجہ چندولال کے درمیان یہ گفت وشنید ہوئی کہ کمپنی سرکار نظام کو ۵۰ لاکھ روپیہ قرض دے۔ اور رائچور، بیڑ یا برار کے علاقوں میں سے کوئی حصہ لے لے[۵۲] لیکن ریزیڈنٹ اور مہاراجہ میں ناچاقی تھی۔ اس لئے یہ معاملہ طے نہ ہو سکا۔ تاہم کمپنی کے ارباب حل وعقد کو اس تجویز سے حالات کا رخ معلوم ہو چکا تھا۔ اسلئے اسی وقت سے آپس میں کھچڑی پکنی شروع ہو گئی کہ دکن کے زرخیز ملک پر کسیطرح تصرف حاصل کیا جائے۔ ۳۰ مئی ۱۸۴۳ء کو کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز نے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ۔

"اگر اب کوئی مالی مصیبت نظام یا ان کے وزیر کو ہم سے مدد کرنے کی درخواست کرنے پر مجبور کرے، تو برٹش گورنمنٹ کی خدمات اس واضح شرط کے ساتھ پیش کردی

---

۵۱ Memoirs P. 44

۵۲ " P. 173

جائیں کہ وہ (یعنی برٹش گورنمنٹ) نظام کی جانب سے ان کے فائدہ کی خاطر ملک کا نظم ونسق پورا کا پورا اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔ اور اگر ایسی صورت میں ہم نے ان کی مملکت کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تو ہز ہائی نس کو صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اسوقت تک واپس نہ کیا جائے گا جب تک ہماری حکومت اس امر کا اطمینان نہ کرے گی کہ نظام یا ان کے جانشین ملک کا عمدہ انتظام کرنے کے لئے مناسب بندوبست کرنیکے قابل پائے جائیں گے۔"[له]

دوسری طرف لارڈ ڈالن برو کلکتہ میں انہی امور پر غور کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ نواب خود اپنے صرف خاص کے خزانہ سے روپیہ دینے پر راضی نہ ہوں گے۔ اور برٹش گورنمنٹ ہی سے مدد طلب کرنا ضروری سمجھیں گے۔ ایسی صورت میں وہ ان کی درخواست کو قبول کرنے کے لئے پوری طرح طیار تھا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ قرض کی ادائگی کا پورا اطمینان ہو جائے۔ اور اس اطمینان کی واحد صورت اس کے نزدیک یہ تھی کہ نظام کے تمام ممالک محروسہ کو برطانی انتظام میں لے لیا جائے۔ اس غرض کے لئے کلکتہ میں ایک معاہدہ کا مسودہ بھی طیار کر لیا گیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ کمپنی نظام کو ایک کرور روپیہ قرض دے گی اور اسکے عوض نظام اپنے تمام ممالک محروسہ کا انتظام برٹش ریزیڈنٹ یا دوسرے کسی افسر کو جسے برٹش گورنمنٹ منتخب کرے، دیوان کی حیثیت سے سپرد کر دیں گے تا آنکہ اصل رقم مع ۵ فیصدی سود برٹش گورنمنٹ کو واپس نہ مل جائے، اور برٹش گورنمنٹ کو اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ ہز ہائی نس اور ان کے جانشین ان ممالک

له Memoirs P. 188

کا انتظام ایسے طریقہ سے کرسکیں گے کہ پھر اس قسم کی مالی مشکلات پیش نہ آئیں۔
اس مجوزہ معاہدہ کی سب سے زیادہ عجیب دفعہ یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ کے انتظام سے ریاست کے مالیات میں جو بچت ہوگی، اس کو برٹش گورنمنٹ خود اپنے تصرف میں لائیگی[۵۱]۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاست پر برٹش گورنمنٹ کا دوامی قبضہ رہے گا، کیونکہ جب تمام بچت گورنمنٹ لے لیتی، تو ایک کروڑ کا قرض مع سود ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہتی، اور جب قرض ادا نہ ہوتا تو ریاست کا واگذاشت ہونا معلوم۔
یہ تھا وہ جال جو "یار وفادار" کو پھانسنے کے لئے طیار کیا گیا تھا مگر خوش قسمتی سے جنرل فریزر اور مہاراجہ چندو لال کے باہمی اختلافات بڑھ گئے یہاں تک کہ ۹ ستمبر ۱۸۴۳ء کو مہاراجہ اپنی خدمت سے الگ ہوگئے۔ اور کمپنی سے قرضہ مانگنے کی نوبت نہ آئی۔ اگرچہ مہاراجہ نے سرکار نظام پر مختلف قسم کے جو قرضے چھوڑے تھے۔ ان سب کو بھگتانے کے لئے ایک سرسری تخمینہ کے مطابق ۹ کروڑ روپیہ درکار تھا[۵۲]۔ لیکن نواب ناصر الدولہ نے اس حوصلہ شکن صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انگریزوں کی طرف استعانت کا ہاتھ نہ بڑھایا۔ یہی واقعہ ہے جس کے متعلق لارڈ والن بروبڑے افسوس کے لہجے میں جنرل فریزر کو لکھتا ہے کہ

"میں سوائے افسوس کے اور کچھ نہیں کرسکتا کہ چندو لال قطعی طور پر عہدہ

---

۵۱ Memoirs P. 187

۵۲ " P. 178

سے الگ ہو گئے قبل اس کے کہ ان کی جگہ کسی ایسے آدمی کے تقرر کا انتظام ہو جاتا جسے تم پسند کرتے، اور ریاست کے زیادہ بھاری قرضوں کی ادائگی کا انتظام ہوتا جنہیں فوجوں کی تنخواہوں کے بقایا بھی شامل ہیں۔ چندو لال محض تمہاری مرضی سے گئے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ نظام پر ہماری گرفت کا سب سے بڑا ذریعہ بھی گیا۔ اب اس کا بوس سے نجات پا کر نظام ہم کو چٹکیوں میں اڑائیں گے، ٹال مٹول کریں گے، اور اصلاح کی راہ میں کچھ نہ کریں گے۔"¹

کنٹنجنٹ کا قرض

پہلے بند کی گرفت کھلتے ہی "یار وفادار" کے لئے دوسرا دام حست کرلیا گیا جس میں آخر وہ پھنس کر رہا۔ گو سرکار انگریزی کو اپنے دوست کا پورا ملک تو ہاتھ نہ آسکا تاہم یہی کیا کچھ کم ہے کہ اس کا ایک تہائی حصہ، اور سب سے زیادہ زرخیز حصہ اس کی دوستانہ دست برد سے نہ بچ سکا۔

کنٹنجنٹ کے مصارف کا جو حال تھا وہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ ایسے مالی انتشار کے زمانہ میں جبکہ ریاست کے مداخل و مخارج کا توازن ہی درست نہ تھا، اس ۴۲ لاکھ سالانہ کے مستقل مطالبہ کو پورا کرتے رہنے پر ریاست کسی طرح قادر نہ تھی۔ مہاراجہ چندو لال پہلے ولیم پامر کی کمپنی سے قرض لیکر اس کو پورا کرتے رہے۔ پھر جب پامر کمپنی ٹوٹ گئی تو ملکی ساہوکاروں کا سہارا ڈھونڈا گیا۔ آخر جب ریاست کی ساکھ بالکل ہی بگڑ گئی تو اس رقم کا ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ اور

---

¹ Memoirs P. 194

تنخواہیں بقایا میں رہنے لگیں۔ جولائی ۱۸۴۳ء میں جب مہاراجہ نے استعفےٰ دیا تو کنٹنجنٹ کی ۶ مہینہ کی تنخواہ بقایا میں تھی۔ جنرل فریزر نے ریزیڈنسی کے خزانہ سے یہ روپیہ ادا کیا۔ اور مرکزی حکومت کو اس کے متعلق لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ جتنے روپیہ کی ضرورت ہو اپنے خزانہ سے دئیے جاو۔ اور نظام کو مہلت دیتے رہو۔[۱] اس طرح کنٹنجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جتنی بقایا نکلتی رہی اُسے ریزیڈنٹ چپکے چپکے اپنے خزانہ سے ادا کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ستمبر ۱۸۴۶ء میں یہ نام نہاد قرض ۴۰ لاکھ کی رقم خطیر تک پہونچ گیا

مہاراجہ چندولال کی علیحدگی کے بعد نواب ناصرالدولہ بہادر نے دیوانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، شعبہ سیاسیات کی نگرانی (جس کا اصطلاحی نام اسوقت وکالت تھا) سراج الملک (ابن منیرالملک) کے سپرد کردی تھی، اور مہاراجہ چندولال کے بھتیجے راجہ رام بخش کو پیشکار مقرر کر دیا تھا۔ اسی انتظام کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن بھاری قرضوں میں سے جو مہاراجہ چندولال چھوڑ گئے تھے، جون ۱۸۴۵ء تک ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپیہ ادا ہو چکا تھا[۲] نواب کی خواہش تھی کہ بذات خود امور ریاست کی نگرانی کریں۔ مگر یہی وہ چیز تھی جسکو انگریزی حکومت نہیں چاہتی تھی۔ انگریزوں کی خواہش یہ تھی کہ نواب محلسرا میں مشغول عیش ونشاط رہیں اور حکومت کا سارا کام ایک ایسے دیوان کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے جو ریزیڈنٹ کے زیر اثر ہو۔ انگریزی ریزیڈنٹ جنرل فریزر نے اپنی تحریروں میں اس خواہش

---

(۱) Our faithful ally. P. 264

(۲) Memoirs P. 205

صاف صاف اظہار بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ۷ رمئی ۱۸۴۴ء کے خط میں
رڈوالن برو کو لکھتا ہے کہ۔

"اس ملک کے اختیارات خود ہمارے ہاتھ میں آنے اور اس کا انتظام
برطانی افسروں کے سپرد کئے جانے سے کم اگر کوئی تدبیر اصلاح میرے خیال
میں آتی ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ ایک ایسا وزیر مقرر کیا جائے
جو برٹش گورنمنٹ کی رائے کیساتھ (جس کا اظہار یہاں کے ریزیڈنٹ کے
ذریعہ ہو) حقیقی نہ کہ بناوٹی اشتراک عمل کرے"[۱]

انہی خیالات کی بنا پر برٹش گورنمنٹ کیطرف سے باربار زور ڈالا جارہا تھا
ایک "لائق" دیوان جلد سے جلد مقرر کیا جائے۔ جب ان پیہم تقاضوں کا کوئی
نہ ہوا تو اپریل ۱۸۴۵ء میں لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے نظام کو ایک خط لکھا
میں ریاست کی بد انتظامی پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کہہ
گیا تھا کہ اگر ہمارے "دوستانہ نصائح" پر توجہ نہ کی گئی تو نتائج خطرناک ہوں
گے۔ جون ۱۸۴۶ء میں جب ہ سرکش زمینداروں نے غدر برپا کیا تو حکومت
نظام کو کنٹنجنٹ کی خدمات دینے سے انکار کر دیا گیا[۲]۔ اور ریزیڈنٹ نے طرح
طرح کی مشکلات پیدا کرنی شروع کیں۔ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا کو لکھا کہ
دیوان کے تقرر کے لئے نظام پر سختی کے ساتھ زور ڈالے اور اس کے ساتھ ہی
قرض کا بھی تقاضا کرے جو کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں ۳۰ لاکھ کی رقم تک پہونچ چکا ہے

---

۱ Memoirs P. 203

۲ " P. 207

اس تجویز کے مطابق ۱۱ ستمبر ۱۸۴۶ء کو لارڈ ہارڈنگ نے نواب ناصر الدولہ بہادر کے نام ایک اور خط لکھا جس میں دیوان کے تقرر اور قرض کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ریزیڈنٹ کو لکھا گیا کہ نظام پر دباؤ ڈالنے کے لئے جس فوجی مظاہرہ کی ضرورت ہے وہ فی الحال ممکن نہیں ہے کیونکہ مدراس کی فوج ساگر و نربدا میں مشغول ہے، بمبئی کی فوج سندھ میں ہے، اور بنگال کی فوج لاہور میں رکی ہوئی ہے[۵۱]۔

انگریزی حکومت کے زور دینے پر نظام ایک مدار المہام کے تقرر پر راضی ہو گئے۔ اور انہوں نے نواب شمس الامراء امیر کبیر کو اس منصب کے لئے منتخب کرنا چاہا لیکن ریزیڈنٹ سراج الملک سے بحث و مباحثہ کر چکا تھا اس نے انہی کے تقرر پر زور دیا۔ اور اعلیٰ حضرت کی ناراضی کے باوجود یہاں تک زور دیا کہ وہ انہی کو تقرر کرنے پر مجبور ہو گئے[۵۲]۔ سراج الملک سے اعلیٰحضرت کی ناراضی کسی ذاتی کاوش کی بنا پر نہ تھی بلکہ محض اس بنا پر تھی کہ انہوں نے اپنے آپ کو ریزیڈنٹ کے حوالہ کر دیا تھا۔ ۲ ر نومبر ۱۸۴۶ء کو (عین اس دن جبکہ سراج الملک مدار المہام بنائے گئے) اعلیٰ حضرت نے خود سراج الملک کی موجودگی میں جو گفتگو کی تھی۔ اس کا مفہوم ریزیڈنٹ کے الفاظ میں یہ ہے:

"بڑے صلاحکاروں نے سراج الملک کی طرف سے ہز ہائی نس کے ذہن کو مسموم کر دیا ہے اور انہیں یہ بات سجھائی ہے کہ میرا مقصد سراج الملک کے تقرر

---

۵۱ Memoirs P. 209

۵۲ تاریخ رشید الدین خانی ص ۳۔ ۲۴۳

کی تجویز کرنے سے در اصل انکو یہ موقع دینا ہے کہ آخر کار ملک کو برٹش گورنمنٹ کے سپرد کر دیں۔[1]

سراج الملک کے مدار المہام ہوتے ہی مطالبۂ قرض کے تمام تقاضے بند ہو گئے اور رزیڈنٹ کے مشورے سے کار و بار سلطنت انجام پانے لگے۔ فوجی معاملات کے سلسلہ میں انگریزی مفاد کی سب سے بڑی خدمت جو سراج الملک نے کی وہ یہ تھی کہ ان دیسی فوجوں کو جن کا ایک بڑا حصہ عربوں اور پٹھانوں پر مشتمل تھا جو کہ نظام کے زیر اختیار تھیں اور جن پر کسی خطرے کے وقت نظام اپنی حفاظت کے لئے بھروسہ کر سکتے تھے، موقوف کرنا شروع کر دیا۔ ریمو کی جمعیت کے منتشر ہونے کے بعد یہی ایک ایسی فوج رہ گئی تھی جس پر نظام کی ساری جنگی طاقت کا انحصار تھا، اور اسی فوج کا وجود انگریزی حکومت کو کھٹک رہا تھا نواب ناصر الدولہ مرحوم کے زمانہ میں اس فوج کی کل تعداد ۵۳ ہزار کے قریب تھی جن میں سے ۱۰ ہزار سپاہی خاص دار السلطنت میں موجود رہتے تھے۔ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ انہیں موقوف کیا جائے یا کم از کم انکی تعداد نصف سے زیادہ گھٹا دی جائے۔ حکومت نظام جب کبھی کنٹنجنٹ کے کثیر اخراجات کے لئے روپیہ بہم پہنچانے سے اپنی معذوری ظاہر کرتی، تو جواب میں یہی تجویز پیش کر دی جاتی تھی کہ اس بیکار انبوہ پر جو ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ تم خرچ کرتے ہو اسے بند کر دو اور کنٹنجنٹ کے لئے روپیہ دو۔ سراج الملک نے انگریزی حکومت کی اسی خواہش کو اپنے عہد وزارت میں پورا کرنے کی کوشش کی اور ۱۸۵۲ء میں تقریباً ۱۰ ہزار فوج کو برطرف کر دیا۔ خود دار السلطنت کی فوج میں سے ۶ ہزار فوج کو انگریزی رسالوں کی مدد سے زبردستی منتشر کیا گیا[2] اور

---

1. Memoirs p. 211   2. Memoirs. PP. 222-23, 261-62

اس طرح مرکزِ حکومت میں حکومت کی خود اپنی فوج صرف ۴ ہزار رہ گئی، حالانکہ سکندر آباد سے الحال تک جو انگریزی فوج پڑی ہوئی تھی اس کی تعداد پانچ چھ ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ سراج الملک کی اسی انگریز پرستانہ پالیسی کو دیکھ کر نواب ناصر الدولہ بہادر کی ناراضگی یہاں تک بڑھ گئی کہ حضور نے انکی باریابی تک بند کر دی اور عیدین پر نذرانہ پیش کرنے کے لئے انکو حاضری کا موقع نہ دیا۔ ستمبر ۱۸۵۱ء میں اعلیٰحضرت نے ریزیڈنٹ کو بلا کر اپنی اس خواہش کا صاف اظہار کر دیا کہ وہ سراج الملک کو مدار المہامی سے الگ کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزی حکومت سراج الملک کی حمایت کا عہد کر چکی تھی اور کرنل لو نے اپنی آنکھ سے کورٹ آف ڈائرکٹرز کا وہ مراسلہ دیکھا تھا جس میں گورنمنٹ آف انڈیا کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سراج الملک کی قطعی تائید کیجائے[1]۔ لیکن اس کے باوجود نواب ناصر الدولہ جیسے فرمانروا کے سامنے کھلم کھلا دیوان کی حمایت نہیں کیجا سکتی تھی۔ اس لئے لارڈ ڈلہوزی نے اکتوبر ۱۸۵۱ء میں ریزیڈنٹ کو لکھا کہ ہز ہائنس خود مختار ہیں جس کو چاہیں وزیر مقرر کر دیں، لیکن انہیں صاف طور پر تنبیہ کر دو کہ اسکا انجام بہت برا ہوگا۔ لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ یہ تھے :-

"گورنر جنرل ہز ہائنس کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر وہ اسی روش پر چلتے رہے تو ان کا ملک خوش حال اور پرامن نہ رہے گا۔ اور ایسی صورت میں برٹش گورنمنٹ خود اپنے مقبوضات کے سکون اور اپنی رعیت کے مفاد کا لحاظ کرتے ہوئے

---

[1] رشید الدین خانی صفحہ ۷۵،۷۶۔

[2] Memoirs P. 356

ایک ہمسایہ ریاست میں شورش و اضطراب کے وجود کو گوارا نہ کر سکے گی خصوصاً جبکہ وہ خود اس کے اپنے مفاد اور سلامتی و اطمینان کے لئے مضرت رساں ہو۔ ایسے حالات میں برٹش گورنمنٹ غالباً اپنے آپ کو مجبور پائے گی کہ ہز ہائنس کی مملکت کے اندرونی انتظام میں قطعی مداخلت کرے تاکہ اپنی رعیت تک اس مضرت اور تکلیف کو پہنچنے سے روک دے جو ایک ہمسایہ ریاست کی پراگندہ حالت سے ان پر نازل ہونی ضروری ہے۔"[۵۱]

یہ تنبیہ نامہ نظام تک پہنچا یا گیا، مگر انہوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا۔ جنرل فریزر نے کہا کہ ایسی حالت میں سراج الملک کی علیحدگی گورنر جنرل کی ناراضی کا باعث ہوگی۔ نواب نے جواب دیا کہ اگر گورنر جنرل ناخوش ہوں گے تو بہتر ہے کہ غفران مآب اور مغفرت مآب کی جگہ پر بھی سراج الملک ہی بٹھائے جائیں۔"[۵۲] آخر کار سراج الملک نومبر ۱۸۴۸ء میں الگ کئے گئے اور ان کی جگہ عارضی طور پر امجد الملک مدار المہام بنائے گئے۔

ادھر سراج الملک ہٹائے گئے، اور ادھر قرض کا تقاضا شروع ہو گیا۔ دسمبر ۱۸۵۰ء میں ریزیڈنٹ کے نام حکم آیا کہ کنٹنجنٹ کے حساب میں نظام کے ذمہ جو قرض ہے اس کی مقدار اب بہت ہو گئی ہے نظام سے کہو کہ سود[۵۳] برابر ادا کرتے رہیں اور اصل رقم کی ادائیگی کا جلد انتظام کریں۔ نیز کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے ادا کرنے میں

---

۵۱ Memoirs P. 266

۵۲ رفیع الدین خانی صفحہ ۳۰۱

۵۳ پہلے ۱۲ فیصدی کی شرح لگائی گئی تھی۔ ۱۸۴۲ء میں اسے گھٹا کر ۶ فیصدی کر دیا گیا۔

اب زیادہ تساہل کو گوارا نہیں کیا جائے گا۔ آخر میں لکھا تھا کہ:۔

"مہربانی صاف طور پر سمجھ لیں کہ اگر ان مطالبات کو باقاعدگی کے ساتھ پورا نہ کیا گیا تو گورنر جنرل ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے جو اُن مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی موثر ہوں جن کا اس گورنمنٹ نے ایمانداری کے ساتھ عہد کیا ہے۔ اور خود اس کے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے بھی[۵۵]"

اس دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ نواب ناصرالدولہ نے امجدالملک کی جگہ نواب شمس الامراء امیر کبیر کو مدارالمہام مقرر کیا۔ اور شمس الامراء نے کنٹنجنٹ کی تنخواہ ماہ بماہ ادا کرنے کا انتظام کر دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ریزیڈنٹ کو یقین دلایا کہ وہ قرض کا سود برابر دیتے رہیں گے اور اصل میں سے ۵ لاکھ سالانہ ادا کریں گے جس سے ۱۲ سال میں کل قرض ادا ہو جائے گا لیکن ریزیڈنٹ نے اتنی مہلت دینے سے انکار کر دیا۔

شمس الامراء نے جس طریقہ سے ملک کا انتظام شروع کیا تھا اس سے امید ہوتی تھی کہ وہ اس عظیم الشان خطرہ سے اس کو بچا لیں گے جو قضائے مبرم کی طرح اس کے سر پر منڈلا رہا تھا لیکن افسوس کہ دربار کی سازشوں نے اس وفادار خادم دولت کو ۵ مہینہ بھی چین سے نہ ٹکنے دیا اور آخر کار مئی ۱۸۴۹ء میں اسے استعفیٰ دینا پڑا۔

جون ۱۸۵۱ء میں ڈلہوزی نے ریزیڈنٹ کو لکھا کہ "ایک خوشگوار صبح کو نظام اپنی نتائج اعمال کے ہاتھوں جھنجوڑ کر جگا دیے جائیں گے"۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا کہ "مجھے بڑا افسوس ہے کہ نظام خود اپنے ہاتھوں اپنا سر پھوڑنے پر تلے ہوئے ہیں لیکن اگر وہ

Dalhousie P. 290

انہوں نے ایسا کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے، تو میں اس کا انتظام کر لوں گا کہ اس گورنمنٹ کے مفاد کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔ اودھ میں ان کی شاہی برادری کا ایک دوسرا بھائی اسی روش پر چل رہا ہے، جونہی کہ لارڈ ہارڈنگ کی دی ہوئی دو سالہ مہلت ختم ہو گی، میں کارروائی کرنے پر مجبور ہوں گا۔ مختصر یہ ہے کہ میرے ہاتھ کچھ عرصہ کے لئے ان موذی رئیسوں سے بھرے رہتے نظر آ رہے ہیں۔[1]

ان دھمکیوں میں جو معنی پوشیدہ تھے وہ کچھ زیادہ عرصہ تک چھپے نہ رہے۔ شمس الامرا کی علیحدگی کے بعد کنٹنجنٹ کی تنخواہیں پھر بقایا میں رہنے لگیں۔ اعلیٰ حضرت نے راجہ رام بخش کو دوبارہ پیشکار مقرر کیا مگر انتظام کے لئے ان سے زیادہ قابل آدمی کی ضرورت تھی۔ آخر ستمبر ۱۸۵۱ء میں نظام کو نوٹس دیدیا گیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۱ء تک تمام قرض ادا کر دیا جائے۔ ورنہ برٹش گورنمنٹ جو مناسب سمجھے گی کرے گی۔ لارڈ ڈلہوزی نے صاف کہدیا کہ بحیثیت قرض خواہ اس گورنمنٹ کو نظام پر رحم کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اب وہ انکو ڈھیل نہیں دے گی۔[2]

قرض کے بدلے ملک کا مطالبہ

ڈلہوزی خود جانتا تھا کہ ۵ مہینہ کی مدت میں نظام کے لئے ۶۰ لاکھ دینے کی رقم معہ سود ادا کرنا مشکل ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ ہی کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں ۳ لاکھ

[1] Memoirs P. 291-92

[2] " P. 299

۲۵ ہزار روپیہ مہینہ کا مستقل خرچ بھی انکے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس لئے اس نوٹس دینے کے بعد ہی نومبر ۱۸۵۲ء میں ریزیڈنٹ کو لکھا کہ اب میں نے ایک آخری کارروائی کرنے کا عزم کرلیا ہے۔ لہذا تم خفیہ طور سے اپنی رائے بتاؤ کہ قرض کے عوض کفالت میں نظام کے ملک کا کونسا حصہ مانگنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے جواب میں جنرل فریزر نے ۱۹ دسمبر ۱۸۵۲ء کو ڈلہوزی کے نام ایک طویل خط لکھا جس کے بعض حصے قابل مطالعہ ہیں :۔

"برار پائیں گھاٹ تجارتی اور زرعی دونوں حیثیات سے نظام کی مملکت کا سب سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش حصہ ہے۔ اور میں نے کبھی نہیں سنا کہ اس کی مالگذاری کے وصول کرنے میں کوئی دقت پیش آئی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ روئی کی پیداوار کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی خطہ اس پر فوقیت نہیں رکھتا اور اس چیز کی پیداوار اور برآمد ہمارے انتظام میں اس سے بدرجہا زیادہ ہو جائے گی جتنی اب تک رہی ہے۔"

آگے چل کر فریزر کہتا ہے کہ اس علاقہ کی آمدنی کے متعلق زیادہ تحقیق کرنا مشکل ہے کیونکہ کھود کھود کر پوچھنے سے شبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ پھر لکھتا ہے :۔

"اگر کل آمدنی صرف ۳۵ لاکھ ہوئی جیسا کہ یہاں فرض کیا جارہا ہے تو اس کی کو قریب کا مزید علاقہ لیکر پورا کیا جاسکتا ہے۔ اور ایسا کرنا ضروری ہی ہوگا جبکہ ہم کنٹنجنٹ کے مصارف کے ساتھ آبادیسائی کی چوتھائی اور مہیپت رام کے خاندان کے سالیانہ کو بھی شامل کرلیں جس کی مجموعی مقدار ۱۲۶۰۰۰۔۔۔۔

---

al Memoirs P. 302

تک پہنچتی ہے۔ نیز ۳۲۴۰۰۰ سالانہ کے سود کو بھی شامل کر لیں جو نظام کے قرض پر عائد ہوگا۔ اس طرح کنٹنجنٹ کا خسارہ اور یہ رقمیں ملکر تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ ہو جائیں گی اور اس کے لئے مناسب ہوگا کہ ضلع دولت آباد کا ایک حصہ بھی لے لیا جائے۔ اگر نظام اس پر اعتراض کریں کیونکہ غالباً وہ اپنی مملکت کے اس حصہ کو ہمارے انتظام میں دینا پسند نہ کرینگے جس میں اورنگ آباد اور دولت آباد واقع ہیں، تو ہم ناندیڑ اور کلم کے اضلاع کا بالائی حصہ طلب کر سکتے ہیں کہ وہ بھی کمی کو پورا کرنے کے لئے کافی ہوگا۔[۵۱]

سنہ کا ابتدائی زمانہ خاموشی کے ساتھ گذرا کیونکہ سال کے آخر تک کی مہلت دی جا چکی تھی۔ نظام ادائے قرض کے انتظام کے لئے برابر جد و جہد میں مشغول تھے لیکن جب سال ختم ہونے کے قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ مدت مقررہ کے اندر قرض ادا نہ کر سکیں گے۔ راجہ رام بخش پیشکار انکی توقعات کو پورا نہ کر سکے قرض کی مقدار ۶۴ لاکھ تک پہنچ گئی اور خزانہ میں کچھ مہیا نہ ہوسکا۔ آخر، ر اکتوبر سنہ کو اعلیحضرت نے نہیں الگ کر دیا۔ اور ریزیڈنٹ کو بلا کر کہا کہ "راجہ رام بخش نے مجھ سے قطعی وعدہ کیا تھا کہ ۶۰ لاکھ روپیہ مہیا کر دینگے، مگر ان کا وعدہ غلط نکلا اب مجھے مزید مہلت دو، میں پچاس دن میں ۳۰ لاکھ روپیہ دیدونگا اور اس کے بعد دو سال کے اندر پوری رقم ادا کر دونگا۔" لیکن ریزیڈنٹ نے مہلت دینے سے نہ انکار کیا اور نہ اقرار۔[۵۲]

---

۵۱ Memoirs P. 305-6

۵۲ " P. 314

۱۶ر دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے سراج الملک کے ہاتھ پھر پیغام بھیجا کہ ہم ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کے حساب سے قرض ادا کر دیں گے لیکن ریزیڈنٹ نے صاف جواب دیا کہ مجھے امید نہیں کہ گورنر جنرل اپنے فیصلہ کو بدل دینگے۔ ۲۲ر دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے خود جنرل فریزر کو بلا کر فرمایا کہ میرے پاس اب بھی سوا کرور روپیہ کے جواہر موجود ہیں تم برٹش گورنمنٹ کو اطمینان دلا دو کہ اس کا قرض ڈوبے گا نہیں لیکن ریزیڈنٹ کا وہی ایک جواب تھا کہ میں آپکے ارشادات گورنر جنرل تک پہنچا دوں گا مگر مجھے امید نہیں کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدلیں گے۔ اس طرح مدت معینہ گذر گئی اور قرض ادا نہ ہو سکا۔ اس وقت قرض کی تعداد ۷۰ لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔

اسی زمانہ میں برار کو جسے ارض موعود سمجھا جا رہا تھا، انگریزی تسلط کے لئے تیار کرنیکی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ انگریزی علاقہ سے روہیلوں کی ایک تعداد کثیر اس علاقہ میں گھس آئی اور اس نے وہاں شورش و بدامنی کا سلسلہ شروع کر دیا ؎۱ اور وہاں کے پرامن باشندے انکی شرارتوں سے بھاگ بھاگ کر انگریزی علاقہ میں پناہ لینے لگے۔ یہ ملک گیری کے لئے جواز کا پہلو نکالنے کی پرانی تدبیر ہے جو مملکت برطانیہ کی توسیع کے لئے بارہا استعمال کیجا چکی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ریزیڈنٹ نے جنوری ۱۸۵۱ء میں ملک برار کا پورا نقشہ معہ تعلقہ وار آمدنی کے بنا کر گورنر جنرل کو بھیجا۔ اور لکھا کہ میری رائے میں برار پائیں گھاٹ اور برار بالا گھاٹ ہمارے مقاصد کے لئے بہترین اضلاع ہونگے مگر انکے ساتھ ہمیں سرکار دولت آباد کو بھی شامل کر لینا چاہئے ؎۲ یہی نہیں بلکہ اسی زمانہ میں جنرل فریزر نے ان افسروں کو بھی نامزد کر دیا جنکو سپرد وہ برار کا انتظام کرنا چاہتا تھا۔

؎۱ Memoirs P. 323 ؎۲ Memoirs P. 326

اسوقت نظام کے لئے مالی مشکلات سے زیادہ پریشان کن یہ چیز تھی کہ وزارت کے لئے کوئی ایسا وفادار آدمی نہ ملتا تھا جو ریزیڈنٹ کے اثر سے آزاد رہکر ایمانداری کے ساتھ ان کی خدمت کرسکے۔ فروری سنہ ۱۸۵۱ء میں اُنہوں نے غور وخوض کے بعد گنیش راؤ کو پیشکار بنایا جس کی خصوصیت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ ریزیڈنٹ کے بجائے خود اعلیٰ حضرت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن سکتا تھا، لیکن اس کی ناقابلیت نے ریزیڈنٹ کو مخالفت کا اچھا بہانہ دیدیا اور اس نے گنیش راؤ کے ساتھ سرکاری تعلق رکھنے سے صاف انکار کردیا۔ اسکی اصلی شکایت یہ تھی کہ نظام نے ایسے شخص کو پیشکار بنایا ہے جو اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہے، حالانکہ اس کو ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں ناچنا چاہیئے۔ فریزر کی رائے میں بہتر تو یہ تھا کہ سارا ملک انگریزی انتظام میں لے لیا جاتا [۵۱]۔ لیکن

---

[۵۱] یہاں اس امر کی تصریح ضروری ہے کہ فریزر سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۸۵۲ء کے وسط تک برابر اس بات پر زور دیتا رہا کہ پوری ریاست انگریزی انتظام میں لے لی جائے لیکن لارڈ آکلینڈ، لارڈ ایلن برو، لارڈ ہارڈنگ، لارڈ ڈلہوزی جیسے گورنر جنرلوں کو اپنے عہد حکومت میں اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اسپر عمل کرتے، ایلن برو کے زمانہ میں جب یہ سفارش کی گئی تو اس نے اپنے ۲۰ فروری سنہ ۱۸۴۳ء کے خط میں صاف طور پر لکھدیا کہ "آج کل سندھ اور ستلج میں فوج کی زیادہ ضرورت ہے، میں جانتا ہوں کہ حیدرآباد میں بھی بہت کچھ کرنا ہے، مگر میں ایک وقت میں دو کام نہیں کرسکتا، جب اس کا وقت آئیگا تو اس کے معاملات کو بھی سلجھایا جائیگا"۔ (میموآئرز صفحہ ۲۰۲) لارڈ ہارڈنگ کے زمانہ میں جب فریزر نے پھر اس مسئلہ کو چھیڑا تو اس نے معذرت کی کہ مدراس، بنگال اور بمبئی کی فوجیں ساگر نربدا، لاہور اور سندھ میں پھنسی ہوئی ہیں اس لئے کچھ نہیں کیا جاسکتا (میموآئرز صفحہ ۲۰۹) پھر لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں اس نے متعدد مرتبہ اس تجویز کو پیش کیا، ڈلہوزی نے منافقانہ انداز میں جواب دیدیا کہ ہمارا ایسا کرنا بدعہدی اور پیمان شکنی کا مترادف ہوگا، مگر واقعہ یہ ہے کہ پنجاب اور صوبہ سرحد کی زبردست فوجی مشکلات نے

اگر ایسا نہ ہو سکے تو۔

"اس کا واحد بدل، اگرچہ بہت ناکافی ہی سہی، صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دیوان اس صریح مفاہمت کے ساتھ مقرر کیا جائے کہ اگرچہ وہ آخر میں تو اپنے بادشاہ اور ملک کے سامنے جوابدہ ہوگا، لیکن حکمرانی میں اس کے اختیارات مطلق ہوں گے۔ اور اسے ریزیڈنٹ کی موافقت سے کام کرنا ہوگا"[۵۱]

ایک دوسری تحریر میں فریزر نے حیدرآباد کی مدار المہامی کے متعلق اپنا نقطۂ نظر اس طرح پیش کیا ہے۔

"اس ملک کے انتظام میں کوئی ایسا شخص اچھی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا جو ملک کے باشندوں کا اعتماد نہ رکھتا ہو، اور اس سے بھی زیادہ ضروری صفت کی حیثیت سے، جس کو برٹش گورنمنٹ کا اعتماد نہ حاصل ہو"[۵۲]

---

۵۱ Memoirs P. 331

۵۲ P. 333

(بقیہ صفحہ ۷۳) اس کو اتنی مہلت نہیں دی کہ حیدرآباد کی پوری ریاست پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا، ۱۸ اکتوبر ۱۸۴۸ء کے ایک خط میں وہ خود لکھتا ہے کہ "خواہ واقعات کچھ پیش آئیں جب تک پنجاب میں جنگ ختم نہ ہو جائے، اور ملک کے اس حصہ کے معاملات طے نہ ہو جائیں، حکومت ہند نہ تو حیدرآباد کی سلطنت میں کسی قسم کی بڑی اصلاحات کا بار اٹھا سکتی ہے اور نہ کسی بڑے سیاسی انقلاب کا انتظام کر سکتی ہے اگر نظام اپنے مصائب کو بڑھانا پسند کرتے ہیں، تو وہ خود اپنے راستہ پر چلتے رہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی ان کی خبر لینے کی فرصت نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ فی الواقع لڑنا ہی چاہیں تو ایسی صورت میں بیشک ہم ان سے نمٹیں گے۔" (میموائرز صفحہ ۲۷۹)

ریزیڈنٹ اور نظام کے درمیان یہی کشمکش جاری تھی کہ ۶ جولائی ۱۸۵۱ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری کی جانب سے ایک طویل مراسلہ جنرل فریزر کو موصول ہوا جس میں برار پائین گھاٹ اور دوآبہ رائچور کے متعلق اس کی تجاویز پر اظہار پسندیدگی کیا گیا تھا، اور گورنر جنرل کی طرف سے اسکو ہدایت کی گئی تھی۔ کہ نظام سے اس ملک کی تفویض کا مطالبہ کرے۔ آگے چلکر اس خط میں لکھا تھا کہ۔

اگر نظام تمہاری مقرر کی ہوئی مدت کے اندر گورنمنٹ کے مطالبات کو پورا نہ کریں تو تم ان سے ایک قطعی جواب لینے کے لئے آخری ملاقات کی درخواست کرنا۔ اگر ہز ہائی نس اس موقع پر بھی راضی نہ ہوں یا ایسے انتظامات کرنے سے قاصر رہیں جو مطلوب ہیں تو اس سے تم گورنر جنرل کو مطلع کرنا؛

اس قسم کی اطلاع ملنے پر تمہیں اس امر کے متعلق ہدایات بھیجدی جائیں گی کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب سے مبینہ اغراض کے لئے مذکورہ اضلاع پر قبضہ کر لو ان ہدایات کے ملنے کی امید پر تم لکھو کہ آیا تمہیں سب سیڈیری فوج اور کنٹنجنٹ کے علاوہ کچھ اور فوج بھی اس فیصلہ کی تعمیل کے لئے درکار ہوگی؟"

اس کے ساتھ ہی فریزر کو لارڈ ڈلہوزی کا ایک خریطہ بھی ملا جو اعلیحضرت کے نام لکھا گیا تھا۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے الفاظ میں اس کا مخاطب ایک "پرانا اور گہرا دوست تھا جس کے ساتھ پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے برٹش گورنمنٹ کے "دوستانہ تعلقات" تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس خط میں اسی "پرانے وفادار" کو اس برٹش گورنمنٹ کے غضب سے ڈرایا گیا تھا جس کی طاقت کا یہ حال

تہا کہ۔

" ہر گاہ خواہد آں عالی شان را پا مال ساختہ بے نام و نشان سازد۔

ان خشمناک دہمکیوں کے ساتہہ دو امور کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک یہ کہ کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں جو قرض ۷۵ لاکھ تک پہنچ چکا ہے اسے ادا کرو۔ دوسرے یہ کہ کنٹنجنٹ کا خرچ باقاعدگی کے ساتھ دو جس کے تم از روئے معاہدہ پابند ہو[1]۔ ان دونوں اغراض کے لئے نظام پر زور لویا گیا تھا۔ کہ وہ اپنی عرب اور دوسری بیقاعدہ فوج کو برطرف کر دیں۔ تاکہ کنٹنجنٹ کی پرورش کے لئے کافی رقم بچ سکے[2]۔

اس خریطہ نے دربار میں ایک کھلبلی مچا دی۔ نواب ناصر الدولہ کو ایک طرف گورنر جنرل کی درشت کلامی سے انتہائی رنج پہونچا۔ اور دوسری طرف ریاست کے مستقبل کے متعلق سخت تشویش لاحق ہوئی۔ آخر اس بلا کو ٹالنے کے لئے انہوں نے جون ۱۸۵۱ء کے آخر میں سراج الملک کو از سر نو دیوان بنایا، اور اسے قرض کے لیے شدید جد و جہد شروع کر دی۔ جو کچھ خزانہ سے مہیا ہو سکا وہ بہت کم تہا۔ کمی کو پورا کرنے کے لئے نواب نے خود اپنے پاس سے ایک جیغہ۔ ایک سرپیچ، ایک کنٹھی، ایک ہار، ایک طرہ، ایک جوڑ دستبند، اور ایک پارہ الماس ناتراشیدہ وغیرہ اُسے رہن رکہا۔ کچھہ ریاست کے امرا سے روپیہ لیا، اور اس طرح ۱۵ اگست ۱۸۵۱ء کو ۳۲۹۶۶۰۲ ۴۰۸۴۶۸۵ روپیہ کلدار ریزیڈنٹ کے حوالہ کئے اب صرف

---

[1] یہ امر ملحوظ رہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے خود بارہا اعتراف کیا تہا کہ نظام پر از روے معاہدہ کنٹنجنٹ رکہنے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

[2] Hydarabad affairs Vol. II. PP. 522-28

روپے باقی رہ گئے تھے جس کے لئے نظام نے ۳۱ اکتوبر تک کی مہلت لی۔ لیکن اس مدت میں اتنی رقم کا انتظام نہ ہو سکا اور دسمبر میں صرف ۷۸۰۳۵۴۷ روپے ادا کئے جا سکے۔

۱۸۵۲ء کا آغاز اس طرح ہوا کہ نظام ادائے قرض کے لئے جاں توڑ جد و جہد کر رہے تھے اور انگریزی حکومت قرض کے بدلہ میں ملک لینے کی تدبیروں میں منہمک تھی۔ اب انگریزی حکومت کی طرف سے قرض کا تقاضا بہت سست ہو گیا تھا بلکہ اپریل ۱۸۵۲ء میں تو لارڈ ڈلہوزی نے ریزیڈنٹ کو لکھ دیا تھا کہ

"کنٹنجنٹ کی تنخواہیں باقاعدہ ادا کرنے کا ضرور انتظام کرو۔ مگر اسوقت کمپنی کے اصل قرضہ کی ادائیگی پر زور دینے سے احتراز کرو"[1]

ڈلہوزی کی خواہش تھی کہ نظام کو کافی عرصہ تک قرض کیطرف سے غافل رکھا جائے۔ اور جب قرض اس حد تک پہونچ جائے کہ ادا کرنا ان کے لئے مشکل ہو تو دفعۃً ملک کی تفویض کا مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء کے اواسط میں اسی پالیسی کے مطابق ملک ہضم کرنے کے نقشے بنتے رہے۔ ڈلہوزی کو پورا احساس تھا کہ موجودالوقت معاہدات سے برٹش گورنمنٹ کو کنٹنجنٹ رکھنے اور اسکا خرچ نظام سے لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ نظام سے ایک جدید معاہدہ کیا جائے جس کی رو سے کنٹنجنٹ کو جواز کا جامہ پہنا دیا جائے۔ اور اگر نظام اسپر راضی نہ ہوں تو ان سے زبردستی دستخط حاصل کئے جائیں۔ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۲ء کو اس نے فریزر کے نام جو خط بھیجا تھا۔ اس میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ

---

[1] Memoirs P. 374

از روئے معاہدہ کنٹنجنٹ کا وجود جائز نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ۔

"میرے بیان کردہ وجوہ کی بنا پر ہم کو قطعی طور پر یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ کنٹنجنٹ کو ایک ایسے معاہدہ کے ذریعہ واضح اور محفوظ بنیاد پر قائم کر دیا جائے جو خاص اسی مقصد کے لئے ۱۸۰۵ء کے معاہدہ کے ضمیمہ کی حیثیت سے طے کیا جائے، کنٹنجنٹ کی مقدار اور اس کے فرائض وغیرہ بصراحت متعین کر دیئے جائیں اور اس کے مصارف کے لئے ایک حصہ ملک برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا جائے۔ یہ علاقہ محض تفویض کیا جائے گا۔ اس کے شاہی حقوق منتقل نہیں کئے جائیں گے۔ اور یہ تفویض اسی بنیاد پر ہوگی جیسے سندھیا نے ۱۸۴۴ء میں گوالیار کا ایک علاقہ کنٹنجنٹ کے لئے تفویض کیا ہے۔ وہ خاص علاقہ جو اسطرح تفویض کیا جائے گا، وہی ہوگا جس کو حکومت ہند اسوقت تک اپنے تصرف میں رکھنے کی خواہش ظاہر کر چکی ہے۔ جب تک کہ وہ قرضہ جو اس کے حق میں واجب الادا ہے پورا کا پورا باز یافت نہ ہوجائے حکومت کے حقوق استعمال کرنے کی قوت، لامحالہ ہم کو ان اضلاع میں حاصل ہونی چاہیئے جو نظام ہمارے سپرد کریں گے"

"اس تفویض کردہ علاقہ کی آمدنی، انتظام کے اخراجات وضع کرنے کے بعد اس طرح صرف کی جائے گی (۱) کنٹنجنٹ کے مصارف میں (۲) مذکورۂ بالا قرض کے سود میں (۳) چھوٹی چھوٹی مدات میں (۴) باقی بچت اگر ہوئی تو وہ نظام کو ادا کر دی جائیگی۔ اور ان کی اطلاع وطمانیت کے لئے مفوضہ علاقہ کے حسابات سال کے سال حکومت ہند کیطرف سے پیش کئے جائیں گے"

اگر نظام اتنے غیر معقول ثابت ہوں کہ وہ ان تجاویز کو جو انہی کے مفاد کے لئے پیش کی جا رہی ہیں، رد کر دیں تو یہ مسئلہ اتنا نازک ہو جائے گا کہ ابھی تک اتنا نازک نہیں ہوا ہے۔ سر دست میں اپنے آپ پر کسی ایسے طریق عمل کے اظہار و اعلان کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا جسے حکومت ہند، اس صورت میں اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کرے گی لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ نظام کی جانب سے کنٹنجنٹ کی نامنظوری کو گورنمنٹ منظور کرے گی (خواہ وہ ایک ایسے رئیس کے طرز عمل کے متعلق کیسی ہی رائے رکھتی ہو جس کا رویہ اتنا غیر دیانتدارانہ ہو گا) تب بھی اس وقت اور آیندہ بھی کچھ عرصہ کے لئے کنٹنجنٹ کو رکھنا پڑے گا۔

.... نظام کو ہرگز اجازت نہیں دی جا سکتی کہ اس فوج کو یکلخت برطرف کر دیں اور اس کے سپاہیوں کو ملک پر بے مہار چھوڑ دیں........

پس اگر نظام کنٹنجنٹ کے بحال رکھنے کو نامنظور کریں تب بھی اس دوران میں کہ اس کو انجام کار فنا کرنے کی نیت سے رفتہ رفتہ گھٹایا جا رہا ہو۔ اس کے مصارف کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ اس غرض کے لئے بھی ملک کی تفویض اتنی ہی ضروری ناگذیر ہے جتنی دوسری صورت میں ہو سکتی ہے۔ نظام کو ملک دینے پر راضی ہونا چاہیئے۔ اگر وہ انکار کریں گے تو برٹش گورنمنٹ حق و انصاف پر ایسی دست برد کو ہرگز گوارا نہ کرے گی اور بیان کردہ اغراض کے لئے ان علاقوں پر عارضی قبضہ زبردستی حاصل کرے گی"۱؎

اس خط کے جواب میں جنرل فریزر نے اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے

۱؎ Memoirs P. 377-79

لارڈ ڈلہوزی کو بتایا۔ کہ اس کی تجاویز نظام کے حق میں کیسی ہیں۔ اس نے لکھا کہ۔

"جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس مجوزہ انتظام کا درست اور حق بجانب ہونا ناقابل انکار ہے۔ مگر جہاں تک نظام کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس تجویز میں ان کی یقینی بربادی اور ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے انکے اقتدار کی کامل موت ہے۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ نظام کو اگر بُرے سے بُرے حالات میں بھی مبتلا کر دیا جائے۔ تب بھی وہ برٹش گورنمنٹ کے قطعی مطالبات یا احکام کی تعمیل میں کوئی مزاحمت کر سکیں گے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہمکو ان سے اس خاموش مقابلہ کی ضرور توقع کرنی چاہیئے۔ جو اس شکل میں ہوگا کہ وہ مطلوبہ اضلاع کو ہمیں باقاعدہ تفویض کرنے سے انکار کر دیں گے اور اگر ہم ان اضلاع پر قبضہ کر لینا ہی پسند کریں، تو وہ ہمکو جو ہمارا جی چاہے کر لینے دینگے"[1]

ایک طرف "یار وفادار" کو "برباد" کرنے اور اس کے ملک پر "زبردستی" قبضہ کرنے کے لئے یہ منصوبے ہو رہے تھے۔ اور دوسری طرف خود "یار وفادار" اپنی عزت اور سلطنت کو بچانے کے لئے آخری جدوجہد کر رہا تھا ۱۸۵۲ء کے آخری زمانہ میں حیدرآباد کے بڑے بڑے ساہوکاروں کی ایک انجمن مسٹر ڈایٹن (Dighton) کے زیر صدارت قائم کی گئی۔ تاکہ متحدہ سرمایہ سے ایک سرکاری بینک کھولے، اور حکومت کی مالی حالت درست کرنے کی کوشش کرے

---

[1] Memoirs P. 383-84

نواب ناصر الدولہ بہادر نے اس جماعت سے ۴۰ لاکھ روپیہ قرض لینے کا بندوبست کیا اور کفالت میں نہایت قیمتی جواہر پیش کئے جنھیں مسٹر ڈفیٹن کی حفاظت میں دیدیا گیا۔ اس انتظام کے بعد سراج الملک نے ریزیڈنٹ کو مطلع کیا۔ کہ عنقریب کمپنی کا قرض ادا کردیا جائے گا اور ریزیڈنٹ نے اس کی اطلاع لارڈ ڈلہوزی کو دیدی۔ اگر لارڈ ڈلہوزی ایک "ایماندار پبلک مین" ہوتا جیسا کہ اسکا دعویٰ تھا۔ تو اسے اس اطلاع کو اطمینان کی نظر سے دیکھنا چاہئے تھا، لیکن اس کے برعکس یہ خبر سنتے ہی وہ پریشان ہوگیا، اور اس نے فوراً ریزیڈنٹ کو لکھا کہ "برطانی رعایا کے کسی فرد کی جانب سے کسی دیسی والی ریاست کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز یا گورنمنٹ آف انڈیا کے کسی گورنر یا اجلاس کونسل کی اجازت کے بغیر روپیہ قرض دیا جانا پارلیمنٹ کے ایکٹ (3.7 Georage III ch. 142. sec. 28) کے خلاف ہوگا" اس کے ساتھ ہی ڈلہوزی نے ریزیڈنٹ کو حکم دیا کہ بلا تاخیر اس کو اطلاع دے کہ یہ بینک کن لوگوں نے کھولا ہے اور کون اس کو چلا رہا ہے؟ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی یورپین ہو تو حیدرآباد کی حکومت کو معاہدۂ ۱۷۹۸ء کی دفعہ ۴ کے ماتحت اس سے کوئی کام لینے یا اسکو اپنے حدود مملکت میں رہنے کی اجازت دینے سے روک دیا جائے۔[۱]

اس حرکت کے معنی بیان کرنا اس کی وضاحت کی توہین کرنا ہے۔ اسمیں انگریزی قوم کے سیاسی اخلاق کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ اتنی روشن ہے۔

---

[۱] Memoirs PP. 389-90

کہ شرح و بیان کی محتاج نہیں۔ لارڈ ڈلہوزی برار لینے کا عزم کر چکا تھا۔ قرض وصول ہوتے یا نہ ہوتے، کنٹنجنٹ کے قائم رہنے یا نہ رہنے کی اسکو پرواہ نہ تھی اسے بہرحال برار لینا تھا۔ اس لئے جو کوئی اس کی اس خواہش میں مزاحم ہوتا، اُسے قدرتی طور پر ایسا ہی مجرم ہونا چاہئے تھا کہ حیدر آباد میں کاروبار کرنا کیا معنی نظام کے ممالک محروسہ میں بھی اس کے خطرناک وجود کو نہ رہنے دیا جاتا چنانچہ مسٹر ڈائین کو بہت جلدی حیدر آباد سے نکالدیا گیا، اور چونکہ وہ بھی لارڈ ڈلہوزی کے ہم قوم تھے، اس سلئے ان کا بھی کم از کم اتنا فرض ضرور تھا کہ چلتے چلتے وہ جواہرات بھی لے جاتے جو مجوزہ قرض کی کفالت میں حضور نظام نے دئے تھے۔ ان جواہرات کو بعد میں سر سالار جنگ مرحوم نے بڑی کوشش سے حاصل کیا جبکہ قریب تھا کہ وہ ہالینڈ میں بیچ دئے جاتے۔[1]

اس طرح جب روپیہ حاصل کرنے کی تمام تدبیروں میں ناکامی ہوئی۔ اور شاہی خزانہ کے بیش قیمت جواہر کا ایک بڑا حصہ قبضہ سے نکل گیا۔ تو نظام بالکل بے بس ہو گئے۔ ان کی سلطنت کی مالی حالت اسوقت حد سے زیادہ خراب ہو رہی تھی خزانہ بالکل خالی تھا۔ وسائل ثروت تقریباً سب کے سب ۵۰ سال کی مسلسل بدنظمی اور فضول خرچی کی نذر ہو چکے تھے، آمد و خرچ کے عدم توازن کا یہ حال تھا کہ ۲۷ لاکھ روپیہ سالانہ کا پیہم گھاٹا آرہا تھا۔ صرف فوج کا خرچ ایک کرور سالانہ سے زائد تھا حالانکہ ریاست کی کل آمدنی نظم و نسق کے مصارف کو وضع کرکے صرف ایک کرور ۲ لاکھ تھی، ایسی حالت میں ریاست کے خزانہ سے ۵۰ لاکھ روپیہ کا قرض

[1] Memoirs P. 392

ادا کرنا اور پھر ۴ لاکھ روپیہ سالانہ بھی ادا کرتے رہنا ناممکن تھا۔ اب دوسری صورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ اس خاندانی دولت کو نکالا جاتا جو نظام کے بزرگوں نے ڈیڑھ صدی کے اندر جمع کی تھی سوانگریز دوستوں کی بدولت اس خاندانی دولت کا بھی ایک معتد بہ حصہ ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی چھن گئے۔ یہی بے بسی کی حالت تھی جس میں نظام کو تفویض برار کے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا گیا جو کرنل ڈیوڈسن اسسٹنٹ ریزیڈنٹ کے الفاظ میں "دھمکیوں اور بھبکیوں کا نتیجہ تھا۔

قرض کی اصلیت

تفویض برار کا معاہدہ جس طرح ہوا اس کی کیفیت بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ قرض جس کی خاطر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس کی اصلیت کیا تھی، اور قانوناً، عرفاً، اخلاقاً وہ کہاں تک نظام کے ذمہ واجب الادا ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے ذیل کے امور خاص طور پر قابل غور ہیں۔

(۱) کنٹنجنٹ قائم کرنے کے لئے نظام کی باضابطہ منظوری حاصل نہیں کی گئی تھی، اور محض پیشکار سے معاملہ طے کر کے اسکو نظام کے سر چپک دیا گیا تھا۔ یہ فعل نہ صرف قانوناً ناجائز تھا۔ بلکہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۵ کے بھی خلاف تھا جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ "ہز ہائی نس کی اولاد، عزیز و اقارب رعایا اور ملازموں سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھے گی"[۱] اس معاہدہ کی رو سے کمپنی کی حکومت

---

[۱] Aitchison vol. IX. P. 72

کو کوئی حق نہ تہا کہ نظام کی اجازت کے بغیر بالا بالا پیشکاہ سے ایک ایسا معاملہ طے کر لیتی جس سے سلطنت کے خزانہ پر ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ کا ناقابل برداشت بار پڑتا تھا۔

(۲) کنٹنجنٹ باوجود یکہ نظام کے خرچ پر رکھی گئی تھی مگر اس کے انتظام میں نظام کو کوئی دخل دینے کی اجازت نہ تھی۔ خود کمپنی کے ذمہ دار افسروں نے حتیٰ کہ خود گورنر جنرل نے تسلیم کیا کہ کنٹنجنٹ کے مصارف حد سے زیادہ ہیں، لیکن جب تک اس کا خرچ نظام کے خزانہ سے وصول ہوتا رہا اس وقت تک اس میں ایک پیسہ کی کمی نہیں کی گئی۔ اگر کمپنی تفویض برار کے معاہدہ سے صرف ۴ سال پہلے ہی کنٹنجنٹ کے مصارف میں اتنی تخفیف کر دیتی جتنی کہ معاہدہ کے بعد چار سال کے اندر اس نے کی تو ۱۸۵۳ء میں نظام کے ذمہ کمپنی کا ایک پیسہ قرض نہ ہوتا، بلکہ نظام کے خزانہ میں الٹے دس لاکھ روپیہ بچ رہتے۔

(۳) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۱۲ کی رو سے نظام نے صرف یہ عہد کیا تھا کہ کسی تیسری طاقت سے جنگ چھڑنے کی صورت میں وہ ۱۵ ہزار سپاہیوں سے انگریزی حکومت کی مدد کریں گے۔ اس کا یہ ہرگز منشا نہ تہا کہ وہ اپنے خرچ سے انگریزوں کی مدد کے لئے خود انگریزوں کی نگرانی میں ۹ ہزار فوج ہمیشہ رکھیں گے، خواہ جنگ ہو یا نہ ہو۔ خود لارڈ ڈلہوزی کے اقرار کے مطابق ۵۰ سال تک انگریزی حکومت کو ایسی کوئی جنگی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جس کے لئے نظام سے مدد طلب کی جاتی۔[1]
پس اس لحاظ سے نظام کو خواہ مخواہ ۵۰ سال تک ۲۴ لاکھ روپیہ سالانہ (یعنی کل

---

[1] Dalhousie Memoirs P. 425

۳ اکرور ۰۰ لاکھ ادا کرنے پر مجبور کیا گیا، حالانکہ معاہدہ کی رو سے ان پر یہ روپیہ دینے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔

(نمبر ۱) سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام نے ۶۲ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی کا ملک (جو میسور کی دو لڑائیوں میں ان کے ہاتھ آیا تھا) کمپنی کو اس غرض سے دیا تھا کہ وہ ان کی امداد کے لئے فوج رکھے، جسکا خرچ اس وقت ۴۰ لاکھ سالانہ تھا، اس امدادی فوج کا از روئے معاہدہ یہ فرض قرار دیا گیا تھا کہ۔

"اگر مستقبل میں شورا پور یا گدوال کے زمیندار یا ہز ہائینس کی حکومت کے دوسرے وابستگان یا توابع (Subjects or dependants) سرکار کے جائز مطالبات کو جو ان پر ہوں ادا نہ کریں یا بغاوت کی آگ بھڑکائیں، یا شورش پھیلائیں تو جمعیت نظبندی (Subsidiary force) یا اسکا اتنا حصہ جو ضروری ہو، جرم کی حقیقت پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد ہز ہائینس کی اپنی افواج کی معیت میں ایسے تمام مجرموں کو اطاعت پر مجبور کرنے کے لئے جانے پر طیار رہوگی"۔

اس دفعہ کی رو سے سرکار نظام اس امر کا پورا حق رکھتی تھی کہ اس کی رعایا میں سے جب کبھی کوئی سرکشی کرے تو وہ جمعیت نظبندی کی خدمات کمپنی سے حاصل کرے لیکن کمپنی چونکہ اس فوج کا خرچ مع شئے زائد نظام سے وصول کر چکی تھی، اس لئے اس نے شورشوں اور سرکشیوں کو فرو کرنے کے لئے اس کی خدمات دینے سے ہمیشہ انکار کیا، اور ان ہی فرائض کو جو جمعیت نظبندی پر از روئے معاہدہ عائد ہوتے تھے،

کنٹنجنٹ پر ڈالدیا، کیونکہ اس کے مصارف کا بار خود نظام کے خزانہ پر پڑتا تھا۔
۵۰ سال کی مدت میں حیدرآباد کنٹنجنٹ نے سرکار نظام کی جتنی خدمات انجام دیں وہ سب کی سب ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے خود کمپنی کی جمعیت نعلبندی کو انجام دینی چاہئے تھیں، اس لئے حکومت نظام سے اُن کا معاوضہ وصول کرنا جبکہ معاوضہ پہلے ہی ۶۳ لاکھ کے ملک کی صورت میں دیا جاچکا تھا، سراسر ناجائز تھا۔

(۵) جمعیت نعلبندی کے فرائض منصبی انجام دینے کے لئے خود نظام کے خرچ پر کنٹنجنٹ رکھ کر، انگریزی حکومت نے یہ فائدہ اٹھایا کہ جمعیت نعلبندی کے مصارف میں بہت کمی ہوگئی، صرف یہی نہیں کہ فوجی خدمات ادا کرنے میں جو خرچ ہوتا وہ بچ رہا، بلکہ حکومت نے فوج کی تعداد کو بھی اس سے کم کردیا جتنی از روئے معاہدہ اس کو رکھنی چاہئے تھی۔ خود کورٹ آف ڈائرکٹرز میں میجر مور نے جو بیان ، ر نومبر ۱۸۵۳ء کو دیا تھا اسمیں وہ لکھتا ہے کہ۔

"ہم نے اپنی امدادی فوج کی رجمنٹوں کی عددی قوت کو پیدل فوج میں ایک ہزار بندوق برداروں سے گھٹا کر ۵۰۰ کردیا، اور سوار فوج میں ۵۰۰ شمشیر زنوں سے کم کرکے ۴۲۰ کردیا ہے۔ اور اس طرح گذشتہ ۳۰ سال سے حیدرآباد کے علاقہ میں ہم نے جو فوج رکھی ہے وہ اس تعداد سے بقدر

ملہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے طے ہوا تھا کہ ۸ ہزار سپاہیوں کی ۶ پلٹنیں اور ایک ہزار سواروں کی ۲ رجمنٹیں رکھی جائیں گی، مگر میجر مور کے بتائے ہوئے حساب کے مطابق کمپنی نے سپاہیوں کی تعداد ۸ ہزار سے گھٹا کر ۶ ہزار کردی اور سواروں کی تعداد ایکہزار سے گھٹا کر ۸۴۰۔ (دیکھو ایچی سن جلد ۹ صفحہ ۶۸ و ۶۹)

زائد از یک ربع کم ہے جس کے رکھنے کا ہم نے عہد کیا تھا اور جس کا خرچ بھی ہم پیشگی وصول کر چکے تھے، ہم نے اپنے عہد و پیمان میں یہ کوتاہی کس بنا پر کی؟ ہمکو اس فوج کا خرچ وصول کرنے کا کیا حق تھا جو درا صل ہم نے نہیں رکھی؟ اگر اوپر کے واقعات درست ہیں تو کیا ہم اس پر مجبور ہیں یا نہیں کہ ہم نے جو کچھ نظام سے وصول کیا ہے اور جس کا بدل ان کو نہیں دیا ہے اس کا حساب نظام کو دیں؟"[لہ]

پس انصاف یہ چاہتا ہے کہ ۴۰ سال تک ۲۱۶۰ سپاہیوں کی کمی سے انگریزی حکومت جو روپیہ بچاتی رہی وہ نظام کو واپس دیتی۔ کم از کم اندازہ کے مطابق یہ رقم دو کروڑ روپیہ سے کم نہ تھی، اور اس حساب سے ۱۸۵۳ء میں بجائے اس کے کہ کمپنی حضور نظام سے ۴۴ لاکھ روپیہ کے قرض کا مطالبہ کرتی، حضور نظام کو اس قرض کی رقم وضع کر کے کمپنی سے ۱۵۶ لاکھ کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا۔

(۲) ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۳ء تک کمپنی ناجائز طور پر جالنہ اور سکندرآباد میں حضور نظام کی رعایا سے آبکاری کے محاصل وصول کرتی رہی۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں سرکار نظام نے اس پر اعتراض کیا اور اپریل ۱۸۵۲ء میں خود نواب ناصر الدولہ بہادر نے اس مد کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس مد کی آمدنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ تھی اور ۴۱ سال سے وصول کی جا رہی تھی، اگر اس کا سود نہ لگایا جاتا، تب بھی ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے ذمہ سرکار نظام کا ۴۱ لاکھ روپیہ واجب الادا تھا۔

لہ Memoirs. P.361

یہی امور ہیں جن کی بنا پر انگریزی ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے مراسلہ میں صاف لکھدیا تہا کہ

"میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ اگر دونوں حکومتوں کے مالی مطالبات کی غیر جانبداری کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے تو ہم ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) کے موجودہ قرض کا کوئی جائز دعوی نظام پر نہیں کرسکتے۔ جسوقت ہز ہائی نس کے مدار المہام پر کنٹنجنٹ کے بقایا کا تقاضا کیا گیا تہا تو اس نے ۹ اگست ۱۸۵۱ء کو اپنے ایک نوٹ میں سکندر آباد اور جالنہ کی آبکاری کے محاصل میں نے فاضل باقیات کا مطالبہ کیا تہا۔ ہم اس آمدنی کو جو ایک لاکھ سالانہ تک پہنچتی ہے ۱۸۱۲ء سے ۱۸۵۳ء تک یعنی ۴۱ سال تک اپنے حساب میں وصول کرتے رہے حالانکہ یہ رقم بغیر کسی سود کے ہمارے مطلوبہ قرضہ میں سے ۴۱ لاکھ روپیہ نظام کے حساب میں جمع کر دیتی۔ . . . . مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوجانی چاہئے کہ ۱۸۵۳ء میں ہم نظام پر کوئی جائز مالی مطالبہ نہیں رکہتے تھے یا اگر رکھتے بھی تھے تو بہت کم۔"[۱]

یہ ہے اس قرض کی حقیقت جس کے لئے نظام پر اسقدر سخت تقاضے کئے جارہے تھے، جس کے لئے نظام کی "دیانتداری" معرض بحث میں لائی جارہی تھی، اور جسکے لئے لارڈ ڈلہوزی انگریزی حکومت کے "حقوق" اور "مفاد" کی حفاظت کرنے پر اسقدر مستعدی کے ساتھ آمادگی ظاہر کر رہا تھا بنئے، مہاجن تو اپنے قرضداروں پر صرف اتنا ہی ظلم کرتے ہیں کہ اپنی بہی میں سود در سود لگاکر فرضی حساب بناتے چلے جاتے ہیں۔ اس

---

[۱] Memoirs P. 365

سے زیادہ ان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اپنا مطالبہ پورا کرانے کے لئے انہیں پہلے عدالت میں جانا پڑتا ہے، پھر اُسے قانوناً جائز ثابت کرکے ڈگری حاصل کرنی پڑتی ہے، پھر قرق امین کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے نظام کو جس قرضخواہ سے واسطہ پڑا تھا، وہ بیک وقت مہاجن بھی تھا، منصف بھی تھا، اور قرق امین بھی، اس نے پہلے خود ہی حساب بنایا، پھر اپنے ہی حق میں ڈگری بھی دے لی۔ اور اس کے بعد خود ہی قرقی کا وارنٹ بھی لے آیا، ایسے دائن کے مقابلہ میں بیچارے مدیون کے لئے اپنی جائداد ضبط کرا دینے کے سوا اور کیا چارہ کار باقی رہ سکتا ہے۔

تفویض برار

آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ ضبطی جائداد کی کارروائی کس طرح عمل میں آئی۔

مارچ ۱۸۵۳ء میں کرنل لو رزیڈنٹ بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ ۲۰ اپریل کو اُسے نظام کے ساتھ ایک جدید معاہدہ کی گفت وشنید کرنے کے لئے خاص ہدایات وصول ہوئیں، اور اس کے ساتھ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ بھی پہنچا جس میں کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ۳۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا ملک دوامی برٹش گورنمنٹ کو تفویض کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ کرنل لو نے یہ مسودہ سراج الملک کو دکھایا تو انہوں نے اپنے آقا کے حق نمک کو فراموش کرکے اور خود اپنے وطن کی عزت کو بھلا کر جواب دیا کہ ”ریاست کے معاملات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کو اپنے تئیں خوش قسمت سمجھنا چاہئے کہ انہیں ایسا معاہدہ کرنے کا موقع مل رہا ہے

ایک بچہ بھی اگر وہ تعصب اور غلط صلاح کاروں کے اثر سے پاک ہو، تو وہ دیکھ لیگا کہ مجوزہ معاہدہ کو قبول کرنے میں نظام اور ان کی حکومت کے لئے بڑی اور واضح منفعت ہے۔" اس کے بعد جب یہی مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اسے سنتے ہی انہوں نے فرمایا کہ "خدا نہ کرے کہ مجھے یہ ذلت سہنی پڑے"[1] اس کے بعد اعلیٰ حضرت مغفرت منزل نے ایک تقریر کی جس کے بعض بعض حصے کرنل لو نے اپنے چار مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں نقل کئے ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں ان کے جذبات کیا تھے، انہوں نے فرمایا کہ۔

"ہاں تم پہلے بھی مجھ سے کہہ چکے ہو کہ تم ایک نیا عہد نامہ تجویز کرنے والے ہو، مگر تم نے کبھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میرے سامنے اس قسم کا معاہدہ پیش کیا جانے والا ہے، تم نے مجھ سے کبھی نہیں کہا کہ تم مجھ سے میری مملکت کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کی درخواست کرنا چاہتے ہو۔ کیا میں نے کبھی انگریزی حکومت سے جنگ کی ہے؟ یا اس کے خلاف سازش کی ہے؟ یا اس کا ساتھ دیتے رہنے اور اس کی خواہشات کی پیروی کرتے رہنے کے سوا کچھ اور کیا ہے کہ آج میری یہ تذلیل کی جا رہی ہے"؟

کرنل لو نے جواب دیا کہ اس معاہدہ میں آپ کی تذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس پر مغفرت منزل نے فرمایا۔

"ایک بادشاہ کے لئے دو فعل ہمیشہ ذلت آمیز سمجھے جاتے ہیں۔ ایک اپنے آبائی ملک کا کوئی حصہ چھوڑ دینا، دوسرے اپنی بہادر اور کارآزمودہ فوج

---

[1] دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۴ مئی ۱۸۵۳ء نمبر ۸

کو برطرف کر دینا۔ تم جیسے اصحاب کہ کبھی فرنگستان میں ہوتے ہو تو کبھی ہندوستان میں، کبھی امورِ سلطنت میں حصہ لیتے ہو تو کبھی سپاہی بنجاتے ہو، کبھی ملاحی کا پیشہ اختیار کرتے ہو تو کبھی بازرگانی کا (میں نے سُنا ہے کہ تمہارے گروہ میں سے بعض بڑے آدمی سوداگر بھی رہے ہیں) تم اس معاملہ میں میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے، میں ایک خاندانی رئیس ہوں اسی سلطنت میں جو سات پشت سے میرے خاندان میں چلی آرہی ہے، جینے اور مرنے کے لئے پیدا ہوا ہوں. تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی اس سلطنت کا ایک حصہ دوامًا تمہاری حکومت میں دے کر خوش رہ سکتا ہوں؟ اسپر خوش ہونا بالکل ناممکن ہے۔ مجھے اس کو اپنی ذلت سمجھنا چاہیئے۔ میں نے سُنا ہے کہ تمہارے گروہ کے کوئی صاحب یہ خیال رکھتے ہیں کہ اگر مجھے بھی محمد غوث خاں (نواب ارکاٹ) کی حالت میں رکھا جائے۔ تو میں خوش اور مطمئن رہوں گا یعنی مجھے کسی پُرانے ملازم کی طرح ایک وظیفہ دے دیا جائے اور میں کھانے، سونے، اور نماز پڑھنے کے سوا کسی کام سے واسطہ نہ رکھوں۔ مگر (یہاں اعلیٰ حضرت نے ایک عربی کا مقولہ نقل کیا ہے جسے کرنل لو نہیں سمجھ سکا)...... خیر تم میرے شاہانہ احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم کہتے ہو کہ یہ معاہدہ کرنے سے مجھے ۸ لاکھ روپیہ کی بچت ہو جائے گی۔ اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر ۸ لاکھ سے چہار چند بھی بچت ہو۔ تب بھی میں مطمئن نہ ہوں گا کیوں کہ میں اپنا ملک چھوڑ کر اپنی عزت کھو دونگا[۵۱]
اس کے بعد نواب مرحوم نے ریزیڈنٹ کو رام کرنے کی کوشش کی اور اس سے

---

۵۱ Hydarabad affairs vol.11 P. 599-601

کہا کہ اگر محض کنٹنجنٹ اور پچھلے قرض کی خاطر یہ ملک مانگا جا رہا ہے تو میں چار مہینہ کے اندر اندر قرض ادا کر دوں گا اور آئندہ کے ماہ بماہ تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ مگر وہاں ملک لینے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اس لئے ریزیڈنٹ نے اس وعدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اعلیحضرت نے کہا کہ۔

"فرض کرو اگر میں یہ کہوں کہ میں کنٹنجنٹ ہی کو نہیں چاہتا۔ تب تم کیا کروگے؟"

کرنل لو نے جواب دیا کہ ایسی صورت میں ہم کنٹنجنٹ کی برطرفی کو قبول کریں گے مگر اسے یکلخت برطرف نہیں کیا جائیگا۔ بلکہ رفتہ رفتہ کیا جائے گا جس میں کئی سال لگیں گے۔ اور اتنی مدت کے لئے پھر بھی ہمکو ان کی تنخواہوں کے لئے ان اضلاع کی ضرورت پڑے گی جو ہم مانگ رہے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ خواہ کنٹنجنٹ رہے یا نہ رہے، دونوں حالتوں میں ملک نہ چھوڑا جائے گا۔ پھر اعلیحضرت نے یہ تجویز پیش کی کہ ملک برار شمس الامرا امیر کبیر کے سپرد کیا جائے۔ اور وہ قرض اور کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے کا انتظام کریں۔ مگر ریزیڈنٹ نے اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ برار کا علاقہ ریزیڈنٹ اور شمس الامرا دونوں کے انتظام میں دیا جائے یہ دوعملی کی صورت ناقابل قبول تھی۔ اسکے بعد ریزیڈنٹ نے ۱۴ رمئی کو گفت و شنید کا سلسلہ بند کر دیا، اور مطالبہ کیا کہ "ہاں" یا "نہیں" کا آخری جواب دیدیا جائے۔ پھر ۱۹ رمئی کو کرنل ڈیوڈسن (اسسٹنٹ ریزیڈنٹ) نے سراج الملک

Hydarabad affairs vol. 11 P. 607

رشید الدین خانی ۲۴۷۔ کرنل لو نے بھی اپنے ۱۳ مئی ۱۸۵۳ء مراسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔

کے نام ایک خط بھیجا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"میرے عزیز نواب۔ مجھے یقین ہے کہ ریزیڈنٹ آج شام کو آپ سے ملاقات کرنے کی خواہش کریں گے۔ تاکہ آپ کو اطلاع دیں کہ نظام سے ان کی گفت وشنید اب ختم ہوتی ہے۔ اور آج کی ڈاک سے وہ گورنر جنرل سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ فوجوں کو حرکت دیں۔

ہز ہائی نس نے چار مہینہ کی مہلت مانگی تھی۔ مگر اس مدت میں بھی یقینی طور پر فوجوں کی تنخواہیں ادا کرنے کی شرط نہیں کی تھی اس لئے اسے نامنظور کیا گیا۔ تاہم اگر وہ ایسا کرتے تب بھی اسے نامنظور کیا جاتا۔ کیونکہ یہ گورنر جنرل کی ہدایات کے خلاف تھا

" ہز ہائی نس نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ ۴۰ لاکھ کا ملک کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لیے شمس الامرا کے ہاتھ میں دیدیں۔ اس پر ریزیڈنٹ نے کہا کہ "نہیں" کیونکہ ان کو اس امر کا یقین نہیں دلایا جا سکتا تھا کہ ہز ہائی نس کی حکومت، یا ان کے افسروں کی طرف سے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی۔ لیکن اگر یہ تعلقے ریزیڈنٹ اور شمس الامرا، یا حیدرآباد کی حکومت کے کسی دوسرے افسر کو کمشنر بنا کر سپرد کر دیے جاتے (اس طرح کہ انہی کو ان اضلاع کا پورا انتظام اور اختیار دیدیا جاتا۔ اور وہ صرف ہز ہائی نس کو سالانہ حساب دینے کے ذمہ دار ہوتے) تب بھی ریزیڈنٹ صرف یہ کر سکتے تھے کہ ان تجاویز کو کلکتہ بھیجدیتے۔ باقی اس کی ذرہ برابر امید نہیں تھی کہ گورنر جنرل اسکو منظور کر لیں گے۔

"ہز ہائی نس نے مذکورہ بالا تجویز یعنی شمس الامرا اور ریزیڈنٹ کی دوعملی) کو بھی قبول نہیں کیا ہے، اس لئے انہوں نے اُس چیز سے نجات حاصل کرنے کا آخری موقع بھی کھو دیا جو ان کے احساس وقار و تمکنت کے منافی تھی۔ اب وہی تجاویز جو پہلے پیش کی گئی تھیں، پھر پیش کی جاتی ہیں، اور ایسے غیر دوستانہ جذبات کے ساتھ کی جاتی ہیں جو میری رائے میں معاملات کو انتہائی حدود تک پہنچا دیں گے۔ فی الحقیقت، میرے پاس پونا سے میرے بھتیجے کا خط آیا ہے جس میں اطلاع دی گئی ہے کہ ۷۰ ہائی لینڈرز اور ہر میجسٹی کی رجمنٹ نمبر ۸ کو حیدرآباد پر چڑھائی کے لئے طیار رہنے کے احکام پہنچ گئے ہیں۔ یہ مت فرض کر لیجئے کہ فوجی کارروائی صرف اضلاع (برار) تک محدود رہے گی۔ اگر آپ ہز ہائی نس کے دوست ہیں تو ان سے التجا کیجئے کہ اپنی ذات اور اپنی عزت کو بچانے کے لئے وہ بات منظور کر لیں جسے قبول کرنے کے لئے گورنر جنرل یقیناً ان کو مجبور کر دیں گے"[۵۲]

کوٹہ، ڈیوڈسن

یہ فوجی حملہ کی دھمکی کسی دشمن کو نہیں دی گئی تھی، بلکہ ایک دوست کو دی گئی تھی اور دوست بھی وہ وفادار دوست جس نے ابتدائے قیام سلطنت برطانیہ سے آجتک کبھی اس سلطنت کے خلاف تلوار نہیں اُٹھائی۔ جو ۱۷۶۵ء سے لیکر آج تک ہر موقع پر اس سلطنت کا ساتھ دیتا رہا، اور جس نے ٹیپو سلطان اور مرہٹوں کے خلاف اس سلطنت کی مدد کر کے اس کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط کیں۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں رہا تھا، جبکہ نواب نظام الملک کی نگاہ

---

۵۲ Memoirs P. 414

لطف کے بغیر مدراس میں فرانسیسیوں سے جان بچانی مشکل تھی، نہ وہ زمانہ رہا تھا جبکہ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی تلوار سے بچنے کے لئے آصفجاہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت تھی، اور نہ وہ زمانہ باقی رہا تھا جبکہ مرہٹوں کی خطرناک طاقت کو مٹانے کے لئے یار وفادار کی مدد درکار تھی، اب وہ تمام نازک زمانے گذر چکے تھے، اور انگریزی سلطنت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ دوستوں کی دوستی اس کے لئے کچھ زیادہ قیمتی نہ رہی تھی، اس لئے پرانا آئین وفاداری بدل گیا، مہر و محبت کی رسم کہن ختم ہو گئی، اور دشمن کو دشمنی کی پاداش میں نہیں بلکہ دوست کو دوستی کے جرم میں وہ بدلہ دیا گیا جو شرفا دشمنوں کو بھی کم دیتے ہیں۔

نواب ناصر الدولہ حیدرآباد پر فوج کی چڑھائی کے معنی سمجھتے تھے، مقاومت بے سود تھی، عربوں، روہیلوں، اور دوسری جنگجو قوموں کی بیقاعدہ فوج اگر لڑتی بھی تو کمپنی کی باقاعدہ فوج کے سامنے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ٹھیر سکتی تھی، اس کے بعد پوری ریاست پر قبضہ کیا جاتا، اور نظام الملک آصفجاہ کے خاندان کیسا تھ بھی غالباً بعینہٖ وہی سلوک کیا جاتا جو اورنگ زیب عالمگیر کے خاندان کے ساتھ دہلی میں کیا گیا۔ لہذا کرنل ڈیوڈسن کے خط کا جواب وہی ہو سکتا تھا جو دیا گیا۔ یعنی دوسرے ہی دن سراج الملک نے ریذیڈنٹ کو اطلاع دی کہ اعلیٰ حضرت معاہدہ کو منظور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ چنانچہ ۲۰ر مئی ۱۸۵۳ء کو کرنل لو خوش خوش دربار میں حاضر ہوئے اور تفویض برار کے معاہدہ پر دستخط لیکر واپس گئے۔ اس معاہدہ کے اہم نکات محتاج تشریح ہیں

(۱) واقعات سے یہ ظاہر ہے کہ نظام اس دستاویز پر دستخط کرنے کیلئے

باکل راضی نہ تھے ۔ انہوں نے آخر وقت تک اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور صرف اسوقت اس کی توثیق کی جب انہیں یقین دلا دیا گیا کہ مزید انکار کی پاداش میں ان کی سلطنت اور ان کی جان تک کی خیر نہیں ہے۔ خود کرنل ڈیوڈسن جو اس وقت اسسٹنٹ ریزیڈنٹ تھا اور بعد میں ریزیڈنٹ کے عہدہ پر ممتاز ہوا اپنے ١١ راکتوبر ١٨٦١ء کے مراسلہ میں اعتراف کرتا ہے کہ "میں ان دھمکیوں اور جھڑکیوں کا عینی شاہد ہوں جو سابق نظام کو گورنمنٹ کی تجاویز قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے دی گئی تھیں"١؎۔ اس تخویف مجرمانہ کے ساتھ جو معاہدہ عمل میں آیا ہو اسکو ایک لمحہ کے لئے بھی "معاہدہ" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلا ہوا استحصال بالجبر تھا اور ساری کارروائی از اول تا آخر ناجائز تھی۔

(٢) امدادی فوج (Subsidiary force) کے متعلق ١٧٩٨ء کے معاہدہ میں طے ہوا تھا کہ وہ "ہز ہائی نس انکے ورثہ اور ان کے جانشینوں کی ذات کی نسلاً بعد نسلٍ حفاظت کرے گی، اور تمام باغیوں اور ان لوگوں کو جو اس ریاست کے ممالک محروسہ میں شورش پھیلائیں نگونسار کرے گی، مگر ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کو استعمال نہیں کیا جائیگا۔ اور نہ سبندی کے طور پر اسکو مالگذاری وصول کرنے کے لئے اقطاع ممالک میں متعین کیا جائیگا" (دفعہ ٥)

١٨٠٠ء کے معاہدہ میں نواب آصفجاہ نے ٦٢ لاکھ کا ملک دیکر مذکورۂ بالا معاہدہ کی اس شرط کو منسوخ کرادیا کہ "ذرا ذرا سی باتوں کے لئے اسے استعمال نہیں کیا جائے گا" اور اس کے بجائے دفعہ ٤ میں یہ طے کیا کہ جب کبھی نظام کی رعایا میں

١؎ Hydarabad affairs Vol. II. P. 432

سے کوئی شخص سرکار نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے سے انکار کرے گا، یا شورش و بد امنی پھیلائے گا تو اس کے خلاف امدادی فوج کو استعمال کیا جاسکے گا لیکن ۱۸۵۳ء کے اس معاہدہ کی دفعہ ۲ میں امدادی فوج کے استعمال پر پھر وہی قید لگادی گئی جو ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۵ میں، ۶۳ لاکھ کا ملک لینے سے پہلے لگائی گئی تھی۔ اور دفعہ ۳ کی رو سے کنٹنجنٹ کے فرائض میں اس خدمت کو داخل کردیا گیا جو ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے امدادی فوج کے فرائض میں شامل تھی یہ ایک کھلی ہوئی فریب کاری تھی۔

(۳) کنٹنجنٹ کا خرچ جب تک نظام کے خزانہ سے وصول کیا جاتا رہا، اس کی عددی قوت میں ایک آدمی کی کمی بھی گوارا نہ کی گئی، مگر جب اس کے مصارف کے لئے ملک مل گیا تو معاہدہ ہی میں یہ بات طے کرلی گئی کہ کنٹنجنٹ کی تعداد ۹ ہزار کے بجائے ۷ ہزار رہے گی۔

(۴) ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے نظام کے ملک میں ان کی مدد کرنے کے لئے امدادی فوج ۹ ہزار کی تعداد میں رہنی چاہئے تھی لیکن ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۲ میں طے کیا گیا کہ اس فوج کی صرف ۳ پلٹنیں اور ایک رسالہ حدود ریاست میں رکھا جائے گا حالانکہ ۸ پلٹنیں اور ۲ رسالے رکھنے کے لئے ۱۸۰۰ء میں ۶۳ لاکھ کا ملک لیا گیا تھا۔

(۵) کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ادا کرنے اور ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کا سود ۶ فی کے حساب سے وصول کرنے کے لئے اس معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے صوبہ برار دوآبہ، اتچور اور شولاپور، احمد نگر کی جانب چند سرحدی اضلاع اپنے

قبضہ میں سے لئے جن کی مجموعی آمدنی اسوقت ۵۰ لاکھ سالانہ تھی۔ پہلے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ دوامی انتقال ملکیت کو نظام منظور کرلیں۔ لیکن اسے نظام نے سختی کے ساتھ رد کر دیا۔ پھر دوسرا مطالبہ یہ کیا گیا کہ تفویض دوامی ہو۔ مگر نظام کے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ پر برقرار رہیں گے۔ نظام نے اس کو بھی نامنظور کیا۔ اس کے بعد یہ چال چلی گئی کہ معاہدہ کے الفاظ کو مبہم رکھا گیا، نظام کو ریزیڈنٹ کے ذریعہ یقین دلایا گیا کہ تفویض محض عارضی ہے اور وہ جب چاہیں "فک الرہن" کرا سکتے ہیں۔ اور دوسری طرف برٹش گورنمنٹ کو مطمئن کر دیا گیا کہ تفویض دوامی ہے اور بر اراب ہمیشہ کے لئے ہمارے قبضہ میں آگیا ہے۔ معاہدہ کی دفعہ (۶) میں صرف یہ الفاظ لکھے گئے تھے کہ۔

The nizam hereby aggrees to assign the districts mentioned,......

(نظام اس تحریر کی رو سے مبینہ اضلاع کو تفویض کرنا قبول کرتے ہیں)
لیکن کرنل لو نے حضور نظام کو مطمئن کرنے کے لئے سرکاری طور پر (form of yulla) انہیں یقین دلایا تھا، جیسا کہ وہ خود اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع صرف اسوقت تک کے لئے کنٹنجنٹ کے مصارف کی خاطر سپرد کئے جاسکتے ہیں، جب تک انکو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہے"[1]

---

[1] Memoirs P. 416

اس کا صاف مطلب تھا کہ جب نظام کو کنٹنجنٹ کی ضرورت نہ رہے، تو وہ اسے موقوف کر کے اپنے اضلاع واپس لے سکتے ہیں۔ مگر یہی کرنل لو اپنے مذکورہ بالا اعلان کے صرف ڈیڑھ مہینہ بعد ۱۹ر جون ۱۸۵۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا سے کہتا ہے کہ:-

"جہاں تک میں جانتا ہوں یہ اضلاع مستقل طور پر ہمارے ہاتھ میں رہنے کے لئے ہیں"[ا۔]

خود لارڈ ڈلہوزی نے اپنی ۳۰ر مئی ۱۸۵۳ء کی یادداشت میں لکھا ہے کہ:-

"نظام نے اول سے آخر تک ایسا رویہ ظاہر کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ملک کی دوامی تفویض سے قطعی اور شدید انکار کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں یہاں تک کہ اضلاع کو اس صورت سے ہمارے سپرد کرنے سے بھی انہوں نے کلیتہً نارضامندی کا اظہار کیا۔ کہ شاہی حقوق انہیں کو حاصل رہیں"

لیکن یہی لارڈ ڈلہوزی فروری ۱۸۵۶ء میں کہتا ہے کہ:-

"ایک معاہدہ کی رو سے جو ۱۸۵۳ء میں کیا گیا، ہز ہائی نس نظام نے صوبہ برار اور اپنی ریاست کے دوسرے اضلاع کو آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں دائمی طور پر تفویض کر دیا تاکہ حیدرآباد کنٹنجنٹ مستقل طور پر رکھی جائے"[ا۔ے]

اس گورنر جنرل اور ریزیڈنٹ دونوں کی بدنیتی ظاہر ہے۔

یہ تھا اس درخت کا پھل جسے ۵۰ سال پہلے بویا گیا تھا۔ پہلے یار وفادار

ا۔ Memoirs P. 417

ا۔ے " P. 417

سے کیا گیا کہ ہم دشمنوں سے تمہارے ملک کی حفاظت کریں گے۔ اور اس حفاظت کے معاوضہ میں ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا ملک لیا گیا جو یار وفادار کے کل مقبوضات کا تیسرا حصہ تہا۔ اس کے بعد خود اپنی اغراض کے لیئے ایک فوج رکھی گئی۔ اور اس کا خرچ دوست سے مانگا گیا۔ غریب دوست اس کے لیئے بھی ۴۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیتا رہا۔ مگر جب اس کا خزانہ بالکل خالی ہوگیا۔ اور اس میں اتنا خرچ دینے کی استطاعت نہ رہی۔ تو اپنی فوج پر خود اپنے خزانہ سے روپیہ خرچ کیا گیا، اور اسے دوست کے حساب میں قرض کے طور پر لکہا جاتا رہا، جہانتک دوست کے امکان میں تہا اس نے اس قرض کو بہی ادا کرنے کی کوشش کی، مگر جب اس کے بدن میں خون کا ایک قطرہ بہی نہ رہا تو انہی دوستوں نے جو اس کے محافظ بنکر آئے تھے، اس غریب کے گلے پر چھری رکہکر اسی ملک کا ایک دوسرا اور زرخیز حصہ اس سے چھین لیا۔ جس کی حفاظت کے لئے وہ اس سے پہلے ایک بڑا حصہ لے چکے تھے۔ حفاظت کی تمام اقسام میں یہ سب سے زیادہ عجیب وغریب قسم ہے جس کی ایجاد پر جزیرۂ انگلستان کے باشندے بجا فخر کرسکتے ہیں!

۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی رو سے انگریزی حکومت نے دولت آصفیہ کو اپنی حفاظت میں لیا تہا۔ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۱۸ء کی لڑائیوں کے بعد جنوبی ہند میں کوئی طاقت ایسی نہ رہی تھی جس سے دولت آصفیہ کو کوئی خطرہ ہوتا۔ حدود ریاست کے چاروں طرف اسی سلطنت برطانیہ کے علاقے پہیلے ہوئے تھے، جو ریاست کی محافظ تہی اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تہا کہ ریاست کے حساب میں فوج کا خرچ سب سے کم ہوتا۔ لیکن دنیا یہ سنکر حیران ہوگی کہ انگریزوں کی محافظت میں آنے اور سب

دشمنوں سے مطمئن ہو جانے کے بعد اس ریاست کا فوجی خرچ اتنا بڑھ گیا۔ کہ اسوقت دنیا کی کسی سلطنت کا خرچ اتنا نہ تھا۔ سب سیڈیری فوج پر ۳۶ لاکھ کنٹنجنٹ پر ۲۴ لاکھ اور خود اپنی قومی فوج پر ۴۶ لاکھ یعنی کل ایک کروڑ ۶ لاکھ روپیہ سالانہ وہ حکومت خرچ کر رہی تھی جس کی کل آمدنی ۲ کرور سے زیادہ نہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں دس روپیہ کی آمدنی رکھنے والا شخص اپنے چوکیدار کو ۹ روپیے دیتا تھا۔ اور خود اپنا گذر صرف ایک روپیہ میں کرتا تھا۔

سنہ ۱۸۴۳ء میں جبکہ مغفرت منزل نواب ناصر الدولہ نے اس ریاست کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ریاست کے مداخل و مخارج کی حالت یہ تھی :[لہ]

آمدنی بوضع اخراجات نظم ونسق .... ۱۲۲۴۹۵۴۵ (کلدار)

خرچ: خاندان شاہی و ملازمین بارگاہ	۲۸۰۱۰۲۷
,, کنٹنجنٹ اور اپا دیسائی کی چوتھ وغیرہ	۴۰۲۴۱۱۴
,, شاہی فوج	۶۴۱۳۸۵۲
,, منصب دار وغیرہ	۱۷۸۰۱۲۶
کل	۱۵۰۱۹۱۱۹
خسارہ	۲۷۳۹۵۷۴

ایسی خراب مالی حالت میں ریاست کو سنبھالنا انسانوں کا نہیں فرشتوں کا کام تھا جس ریاست میں پیہم ۲۷ لاکھ کا سالانہ گھاٹا آرہا ہو، اور باوجود اس کے

لہ Hydarabad affairs vol. II. P. 91-92

اس پر ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل بار بھی ڈالدیا گیا ہو۔ اس کا اس طرح مالی انتشار میں مبتلا ہوجانا بالکل ایک قدرتی بات تھی۔ جیسا کہ کرنل ڈیوڈسن نے اپنے ایک مراسلہ میں لکھا ہے۔

"حقیقتہً تعجب اسپر نہیں ہے کہ یہ ریاست ۱۸۵۳ء میں ۴۴ لاکھ کی قرضدار کیوں تھی، بلکہ اسپر ہے کہ ۵۰ سال تک اس بُری طرح لٹنے اور تباہ ہونے کے باوجود وہ صرف ۴۴ لاکھ ہی کی قرضدار کیوں رہی۔ اس کا بالکل دیوالہ کیوں نہ نکل گیا"[1]

غدر میں نظام دکن کی وفاداری

تفویض برار کے عہدنامہ پر دستخط ہونے کے پانچ روز بعد سراج الملک کا انتقال ہوگیا۔ کسی شاعر نے ان کا مادہ تاریخ اس طرح نکالا ہے۔

ایں بکرد آخر ش سراج الملک
جملہ ملک برار داد و برفت

ان کے بعد ان کے بھتیجے نواب سالار جنگ بہادر مدار المہام بنائے گئے اور راجہ نرندر بہادر (ابن راجہ دہراج بہادر ابن راجہ چندو لال) کو پیشکاری کا عہدہ دیا گیا۔ نواب ناصر الدولہ بہادر غفران منزل عہدنامہ تفویض برار پر دستخط کرنیکے بعد چار سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اور اس کا رنج آخر ان کی جان ہی لیکر رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اور ان کی جگہ نواب افضل الدولہ مسند

---

[1] Hydarabad affairs P. 433

نشین ہوئے جنھوں نے غفران منزل کے انتظامات کو بحال رکھا۔
یہی زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں وہ جنگ آزادی برپا ہوئی جو غلطی سے "غدر" کے نام سے مشہور ہوگئی ہے۔ اپنے ہاتھوں سب کھو چکنے کے بعد ہندوستانیوں کی آنکھیں اسوقت کھلیں جب سب کچھ بگڑ چکا تھا۔ تاہم یہ آخری سنبھالا بھی اتنے زور کا تھا کہ ایک دفعہ انگریزی سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں اسوقت بمبئی کے گورنر نے حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کو تار دیا کہ

If the Nizam goes all is lost

(اگر نظام گئے۔ تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائیگا)

فرمانروائے دکن کی قوت اس گئی گذری حالت میں بھی اتنی زبردست تھی کہ اگر وہ انگریزی سلطنت کے دشمنوں میں شامل ہوجاتے تو یہ سستے داموں حاصل کی ہوئی سلطنت سستے ہی داموں نکل جاتی، اور اگر پھر واپس ملتی بھی تو بہت مہنگے داموں ملتی۔ ایک انگریز مصنف نے بالکل سچ لکھا ہے کہ۔

"اگر نظام بگڑ بیٹھتے تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کیا نتائج رونما ہوتے، ناگپور میں موقع پر جس سازش کا انکشاف ہوا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پاس کی ریاستیں بغاوت کے لئے کسقدر تیار بیٹھی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ترچناپلی کے مسلمان طیارہ فصل پر دست درازی کے لئے صرف حیدرآباد کی طرف سے اشارہ کے منتظر بیٹھے تھے۔ مجھے جس کسی فوجی آدمی سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا اس نے یہی کہا کہ اگر حیدرآباد اٹھ کھڑا ہوتا تو ہم کرنول، ناگپور، بلاری، کڈاپہ، بنگلور، مدراس، ترچناپلی اور دوسرے شہروں میں بغاوت سے نہ بچ سکتے۔

اور یہ بھی مشکل تھا کہ بمبئی جو مدراس ہی کی طرح بے چین تھا، اس مرض متعدی کے اثر سے بچ رہتا۔"

لیکن تمام ان بیوفائیوں اور بدعہدیوں کے باوجود جو انگریزی حکومت نے نواب میر نظام علی خاں کے انتقال سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کی تھیں، اور اس ظلم عظیم کے باوجود جو چار ہی سال پہلے برار کے استحصال بالجبر کی صورت میں کیا گیا تھا، نظام انگریزی حکومت کی وفاداری پر ثابت قدم رہے۔ ان کی رعایا میں قومی و مذہبی جوش پورے زور کے ساتھ بھڑک چکا تھا، حیدرآباد کے مسلمان جہاد کے لئے بے چین تھے، نظام اور ان کے مدار المہام پر مذہب و قومیت کی خاطر ہر قسم کی ترغیبات کا زور ڈالا جا رہا تھا، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس نازک وقت میں یہ بات انگریزوں کی قدرت سے بالکل باہر تھی کہ نظام کو وفادار رہنے پر مجبور کر سکتی لیکن نواب آصفجاہ نے صرف یہی نہیں کہ اپنا وزن دشمنوں کے پلڑے میں ڈالنے سے احتراز کیا، بلکہ اس سے بڑھکر انہوں نے اپنی پوری قوت انگریزوں کی امداد و اعانت میں صرف کر دی، اور انہی کی مدد سے سلطنت برطانیہ ہندوستان میں از سر نو مستحکم ہوئی۔

جسوقت غدر کی اطلاع حیدرآباد پہونچی تو تمام شہر میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ۱۳ جون کو خفیہ طور پر ایک اشتہار شائع ہوا جس میں مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا گیا تھا، اس کے بعد مکہ مسجد میں ایک پرجوش جلسہ ہوا اور سبز علم بلند کر دیا گیا، قریب تھا کہ ہنگامہ برپا ہو جاتا، مگر سالار جنگ نے شہر میں عربی فوج کے پہرے لگوا دیئے اور تمام ہیجان خیز شعلے بجائے کہ بڑھتے منتشر کرا دیا۔ تاہم غیظ و غضب کی آگ جو انگریزوں کے

خلاف بھڑک رہی تھی، فرو نہ ہوئی، اور آخر کار ۲۰ جولائی کی صبح کو روہیلوں کی ایک زبردست جماعت نے ریزیڈنسی پر حملہ کر ہی دیا جسے بڑی مشکل سے روکیا گیا اور حملہ آوروں کے لیڈروں میں سے ایک (طرہ باز خاں جمعدار) کو گولی مار دی گئی، اور دوسرے (مولوی علاء الدین) کو کالے پانی بھیجدیا گیا۔ اسوقت شہر میں تقریباً ۲۶ ہزار روہیلے، سکھ، سندھی، حبشی، اور ترک و مغل موجود تھے اور شہر کی ۸ لاکھ آبادی کا بھی ایک بڑا حصہ مسلح تھا، خود سرکاری فوج کی ہمدردیاں بھی ان لوگوں کے ساتھ تھیں جو انگریزوں کے اخراج کے لئے لڑنا چاہتے تھے ایسی حالت میں نواب افضل الدولہ اور سالار جنگ کے لئے انگریزوں کی وفاداری پر قائم رہنا اور ان کی مدد کرنا جسقدر مشکل تھا، ظاہر ہے، مگر ان تمام نازک حالات کے باوجود انہوں نے ثابت قدمی کے ساتھ پہلے اپنی ریاست میں امن قائم کیا اور اسکے بعد اپنی فوج سے برٹش گورنمنٹ کی امداد کی، جس کی بدولت وسط ہند میں انگریزی تسلط از سر نو قائم ہوا، جھانسی ریخ، اور دھید پور کے معرکے سر ہوئے اور ان زبردست طاقتوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع ہو گیا جو ہندوستان کو سپید خطرے سے نجات دلانے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں، لیکن اس ہنگامہ میں نظام کی صرف مادی امداد ہی انگریزوں کے کام نہیں آئیں، بلکہ اخلاقی امداد نے بھی ان کو بہت کچھ سہارا دیا، اور یہ اخلاقی امداد ایسی تھی جس کا اثر صوبہ سرحد کے دور دراز علاقوں تک پہنچا ہوا تھا، سرسٹلے کاٹن جو ۱۸۵۷ء میں پشاور کی فوج کا کمانڈر تھا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ۔

"شمالی مغربی سرحد کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے متعدد مرتبہ مجھ کو یقین دلایا کہ کسی کسی

دن ہماری حکومت کے خلاف ایک عام بغاوت کھڑی ہو جائے گی۔ دہلی سے مغل اعظم کی نسل مٹ جانے کے بعد وہ نظام کو اپنا بڑا سردار اور اسلامی مقاصد کا سہارا سمجھتے ہیں۔"[1]

حضور نظام کی ان عملی ہمدردیوں کے باوجود انگریز ان کوشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور انہیں ہر وقت یہ بدگمانی تھی کہ یہ سب کچھ خلوص کے ساتھ نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن آخر میں خود رزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کو اعتراف کرنا پڑا کہ

"میں نے ایسے گوشوں اور ایسے طریقوں سے جن پر شکل سے کوئی شبہہ ہو سکتا تھا، نظام کی شدید نگرانی کی ہے۔ اگرچہ پیغامبر ان کے پاس آتے تھے لیکن ان کی داستانیں سننے کے بعد وہ ہر ایسی تحریک میں شریک ہونے سے انکار کر دیتے تھے، جو برٹش گورنمنٹ کے خلاف ہوتی۔"[2]

وفاداری کا صلہ

حضور نظام کی اس بیش قیمت امداد اور مخلصانہ وفاداری پر زبانی تعریف و توصیف کے پھول تو بہت برسائے گئے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کی قدردانی کا عملی ثبوت کیا دیا گیا؟ اس کے لئے ہم کو غدر کے بعد دونوں سلطنتوں کے معاملات پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔

جولائی ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ کی جانب سے حضور نظام کو ۱۰ ہزار پونڈ کے

---

[1] Nine years on the north west Frontier P. 307

[2] Our faithful ally the Nizam P. 291

اور سالار جنگ بہادر کو ۳ ہزار پونڈ کے تحائف بھیجے گئے، مگر دستور قدیم کے مطابق اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت نے ۱۵ ہزار پونڈ کے تحائف گورنر جنرل کو بھیجے، جو از روئے قاعدہ گورنمنٹ کے خزانہ میں داخل کر دیئے گئے، اس تجارت میں گورنمنٹ نے کھونے کے بجائے کچھ پا ہی لیا۔

غدر میں سرکار نظام کی فوج نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے، اور سلطنت برطانیہ کی حفاظت میں جو جان نثاری کی تھی، اسپر از راہ خوشنودی یہ انعام فرمایا گیا کہ جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں کے لئے پانچ پانچ روپے مہینہ کا زائد بھتہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اس "فضول خرچی" کا بوجھ سرکار انگریزی کے خزانہ پر نہیں پڑا، بلکہ خود سرکار نظام ہی کے خزانہ پر پڑا کیونکہ یہ زائد خرچ برار کی آمدنی سے وصول کیا گیا، اور اسے نظام کے حساب میں محسوب کر لیا گیا۔

اس کے بعد "اس گرانمایہ عزت و احترام" کے مزید اظہار کے لئے جو ملکہ معظمہ کے دل میں ہز ہائی نس کے لئے موجود تھی ۱۸۶۰ء کے آخر میں ایک عہدنامہ لکھا گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ غدر کی خدمات کا "اجر" تھا۔ اس معاہدہ میں "یار وفادار" پر جو انعام فرمائے گئے ان کی حقیقت ذرا تشریح کی محتاج ہے۔

(۱) دفعہ دوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے شوراپور کا علاقہ نظام کے کامل شاہی اختیارات میں دیدیا۔ اس علاقہ کی آمدنی ۳ لاکھ ۲۰ ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ پہلے یہ علاقہ خود سرکار نظام کا تھا۔ ۱۸۲۲ء کے معاہدہ کی دفعہ ۷ میں بتصریح گدوال کے ساتھ شوراپور کے زمیندار کا ذکر کیا گیا ہے، اور عہد کیا گیا ہے

اگر وہ سرکار نظام کے جائز مطالبات کو ادا کرنے میں قاصر رہے گا یا بدامنی پھیلائے گا تو اس کے خلاف جمعیت تعلیقداری (Subsidiary force) کو استعمال کیا جا سکیگا۔[۱] ۱۸۲۲ء میں سرکار نظام کو اس سے شکایت ہوئی کہ چند سال سے نہ اس نے پیش کش حاضر کیا اور نہ نذرانہ، معاہدے کے مطابق ریزیڈنٹ سے استمداد کیگئی تو اس نے کیپٹن میڈوز ٹیلر کو تحقیقات کیلئے بھیجا اور آخر میں مطالبات کی تدریجی تحصیل کیلئے دونوں سرکاروں کے اتفاق سے اس کو "اسپیشل ایجنٹ" مقرر کیا گیا، چند سال اس طرح گذرے تھے کہ شورا پور کے نوجوان راجہ نے سرکار نظام کے خلاف بغاوت کر دی، اور اس کی سرکوبی کے لئے جمعیت تعلقداری کی بجائے (جس کا معاہدہ میں وعدہ کیا گیا تھا) کنٹنجنٹ فورس کو بھیجا گیا۔ از روئے عقل اور از روئے قانون یہ لازم تھا کہ اس راجہ کو از سر نو اسی حکومت کا مطیع بنایا جاتا جس کا وہ پہلے باجگذار تھا، لیکن کیا یہ گیا کہ نظام کی فوج سے نظام ہی کی رعیت کے ایک باغی سردار کی سرکوبی کی گئی۔ اور پھر نظام کے بجائے اس کا علاقہ انگریزی مقبوضات میں شامل کر لیا گیا۔[۲]

یہی وہ صریح ظلم تھا جس کی تلافی سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں کی گئی، اور یہ ایسی چیز تھی جسکو مشکل ہی سے صلہ و انعام کہا جا سکتا ہے۔

(۲) کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں حضور نظام کے ذمہ جو ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) "کا قرض واجب الادا" تھا اسکو دفعہ سوم کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے معاف کر دیا۔

اول تو یہ قرض فی الواقع کوئی قرض ہی نہیں تھا، گذشتہ صفحات میں اسکی جو حقیقت بیان کی جاچکی ہے اسے پڑھنے کے بعد کوئی شخص اسے قرض سمجھ سکتا ہے اور نہ اس

---

۱ Aitchison Vol IX P. 72
۲ Hydarabad affairs Vol 11. P. 410

کی معافی کو کسی انعام سے تعبیر کر سکتا ہے، تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ "قرض" ہی تھا، تب بھی جس صورت میں اسے معاف کیا گیا ہے وہ ایسی ہے کہ انگریزی حکومت بجائے نقصان کے فائدہ ہی میں رہی ہے۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) میں یہ طے ہوا تھا کہ ریزیڈنٹ نظام کے تفویض کردہ علاقوں کی آمدنی اور خرچ کا صحیح اور ٹھیک ٹھیک حساب سرکار نظام کے سامنے برابر پیش کرتا رہے گا، اور دفعہ ۹ کے مطابق تمام اخراجات وضع کر کے جو کچھ بچے گا، وہ سرکار نظام کے خزانہ میں داخل کر دے گا[51] اس میں شک نہیں کہ معاہدہ میں یہ تصریح نہیں کی گئی تھی کہ علاقہ مفوضہ کے نظم و نسق کے مصارف کیا ہوں گے، لیکن کرنل لو نے سرکار نظام کو یقین دلایا تھا کہ ۲ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱/۸ سے زیادہ خرچ نہیں کیا جائیگا کرنل ڈیوڈسن اپنے ۹ر جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں صاف لکھتا ہے کہ۔

"مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جنرل لو سی بی نے سابق وزیر سراج الملک اور موجودہ وزیر سالار جنگ کو یہ سمجھنے کا موقع دیا تھا کہ ہمارے انتظام کا خرچ ۲ر فی روپیہ یعنی کل آمدنی کے ۱۲½ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا"[52]

خود گورنر جنرل لارڈ کیننگ اپنے ۷ر جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں تسلیم کرتا ہے کہ

"جب معاہدہ پر دستخط کئے گئے تھے تو نظام کو یہ توقع تھی کہ ان اضلاع کے انتظام کا خرچ ۲ر فی روپیہ یعنی ۱۲½ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگا"[53]

---

۵۱ Aitchison vol. IX P. 96

۵۲ Hydarabad affairs vol. II. P. 410

۵۳ 〃 〃 〃 P. 414

لیکن ان تصریحات کے باوجود علاقہ مفوضہ کی ۵۰ لاکھ سالانہ آمدنی میں سے تقریباً ۱۷ لاکھ روپیہ سالانہ نظم و نسق پر خرچ کیا گیا جو دو گنا اور ۱۱ گنی روپیہ کے قریب تھا، اور دوسرے اخراجات ملا کر اضلاع مفوضہ کی ساری آمدنی انگریزی حکومت نے خود ہی خرچ کر ڈالی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک بجٹ کی ایک پائی بھی سرکار نظام کے خزانہ میں داخل نہ کی گئی۔ خود گورنر جنرل اور ریزیڈنٹ کو اپنی اس فضول خرچی کا اعتراف تھا، کرنل ڈیوڈسن اپنے ۱۹ جولائی ۱۸۵۹ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ

"میں توقع کرتا ہوں کہ عملہ کے اخراجات کی بھاری رقم اور ہمارے انتظام کی فضول خرچی پر وزیر (یعنی حیدرآباد کا مدارالمہام) اعتراض کرے گا۔"[۱]

اسی اعتراض کے خوف سے سات سال تک اضلاع مفوضہ کے حسابات سرکار نظام کو نہیں دیئے گئے، اور باوجود بار بار مطالبہ کرنے کے معاہدانہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے پہلو تہی کی جاتی رہی جس کے متعلق لارڈ کیننگ کو اپنے ۱۰ جولائی ۱۸۶۰ء کے نوٹ میں اعتراف کرنا پڑا کہ۔

"از روئے معاہدہ ہم ان حسابات کو سال کے سال پیش کرنے پر مجبور تھے، یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔"

اور لارڈ لانس کو بھی ۱۳ فروری ۱۸۶۶ء کے ایک مراسلہ میں تسلیم کرنا پڑا کہ۔

"سالانہ حسابات پیش کرنے میں کوتاہی کرنا ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) کے صریح الفاظ سے انحراف تھا۔"[۲]

اس خلاف ورزی معاہدہ سے برٹش گورنمنٹ سات سال تک جو ناجائز فائدہ اٹھاتی

---

۱ Hydarabad affairs P. 410 ۲ Memoirs P. 421-22

رہی اور سرکار نظام کو اس کے تفویض کردہ علاقہ کے اس منافع میں سے جو ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ (۸) کی رو سے اسکو ملنا چاہئے تھا، محروم کر کے جو ظلم کرتی رہی اسکی تلافی کے لئے اس نے ۱۸۶۰ء میں یہ تجویز پیش کی کہ اگر سرکار نظام برٹش گورنمنٹ سے مفوضہ اضلاع کا پچھلا حساب نہ مانگے تو اسکے عوض وہ اس ۵۰ لاکھ روپیہ (حالی) کی رقم کو معاف کر دیگی جو قرض کے طور پر سرکار نظام کے ذمہ واجب الادا ہے۔ ۷ جولائی ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں زیر بحث معاہدہ کی شرائط تجویز کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری نے کرنل ڈیوڈسن ریزیڈنٹ کو لکھا تھا کہ۔

"گورنر جنرل اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ۔ گذشتہ سالوں میں جو زائد سول اخراجات ہوئے ہیں انکو نظام کیطرف سے ۵۰ لاکھ روپیہ حالی کے قرض کی ادائگی کے طور پر تسلیم کریں"[۹]

اور یہی نہیں بلکہ اس پچاس لاکھ کے قرض کی معافی کے معاوضہ میں گورنمنٹ نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ آئندہ کے لئے بھی سرکار نظام اضلاع مفوضہ کے حسابات کا مطالبہ نہ کرے اور مصارف کی کمی و زیادتی کو برٹش گورنمنٹ کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑ دے، چنانچہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ ۶ میں تصریح یہ طے کر لیا گیا کہ ہز ہائی نس نظام کی حکومت اضلاع مفوضہ کے سابق، حال اور آئندہ کے حسابات کا مطالبہ ترک کر دیگی۔ اور اگرچہ برٹش گورنمنٹ پر لازم ہوگا کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے مقررہ مصارف وضع کر کے بچت کی رقم سرکار نظام کے خزانہ میں داخل کرے لیکن مصارف کی تعیین کا اختیار کلیۃً برٹش گورنمنٹ کو ہوگا۔[۱۰] اس شرط سے برٹش گورنمنٹ نے جو فائدہ اٹھایا اسکا حال آگے آتا ہے اسے پڑھکر ہر شخص معلوم کر لیگا کہ ۵۰ لاکھ کے قرض کی معافی کے بدلے اس نے ۲۷ سال کے عرصہ میں اس سے دہ چند فائدہ اٹھا لیا۔ پس اس کو بھی کوئی ذی ہوش "انعام" سے تعبیر نہیں کر سکتا۔

---

۹ Hydarabad affairs P. 414-15 ۱۰ Aitchison P. 105

(۴) دفعہ ۵ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے اضلاع مفوضہ میں سے دوآبہ رائچور اور وہ اضلاع جو کلکٹری احمد نگر اور شولاپور سے متصل واقع ہیں، سرکار نظام کو واپس کردیے اول تو یہ وہی اضلاع تھے جو ۱۸۵۳ء میں زبردستی سرکار نظام سے چھین لئے گئے تھے دوسرے خود گورنر جنرل کے اعتراف کے مطابق کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کیلئے جتنے علاقے کی ضرورت تھی اسکے لئے برار پائیں گھاٹ اور بالاگھاٹ بالکل کافی تھے اور یہ علاقے قطعاً زائد از ضرورت لے لئے گئے تھے۔[۵۱] اسلئے ان علاقوں کو کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے نام سے اپنے قبضہ میں رکھنے کا گورنمنٹ کو کوئی حق نہ تھا اور انہیں واپس کرنے پر وہ مجبور تھی۔ لیکن اس اخلاقی و قانونی فرض کو بھی اس نے بلا معاوضہ انجام نہیں دیا۔ اس نے اس کے بدلے میں متعدد قسم کے فائدے اُٹھائے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

دفعہ ہفتم کی رو سے برار کے وہ تعلقے حاصل کئے جو صرف خاص کے علاقہ میں تھے اور جن کی آمدنی ۸۰۵۰۶۵ روپیہ سالانہ تھی۔

دفعہ ہشتم کی رو سے سرکار نظام کے وہ مقبوضات حاصل کرلیئے جو دریائے گوداوری اور پائیں گنگا کے دوسری جانب تھے ان اضلاع کی آمدنی ۱۶۵۷۷۵ روپیہ سالانہ تھی۔ اور ان کے جنگلات کی لکڑی کی قیمت بھی ۵۰ لاکھ روپیہ سے کم نہ تھی۔[۵۲] علاوہ ازیں اس علاقہ کے حاصل کرنے سے انگریزی حکومت کو فوجی فوائد بھی حاصل ہوئے جنکو کیپٹن ہیگ (سکریٹری P.W.D.)، ڈسٹرکٹ انجنیر نے اپنے ۳۰ اگست ۱۸۶۰ء کے مراسلہ میں بیان کیا ہے۔[۵۳] اس علاقہ کو حاصل کرنے کیلئے برٹش گورنمنٹ اسقدر بے چین تھی کہ سرکار نظام کو صاف طور پر لکھدیا گیا تھا کہ

---

۵۱ دیکھو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری کا مراسلہ مورخہ ۷ جولائی ۱۸۶۰ء نمبر ۱۸۱۵ صیغہ خارجہ۔
۵۲ ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۳ اپریل ۱۸۶۰ء۔
۵۳ Hydarabad affairs vol.II. P.429

"برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس نظام کو گوداوری کے تعلقوں کی تفویض سے پھر جانے کی ہرگز اجازت نہ دے گی، اور اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں گے، تو اس سے دونوں حکومتوں کے درمیان غیر دوستانہ اور غصہ وناراضی کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔"[۱]

یہ فوائد اٹھانے کے بعد اگر برٹش گورنمنٹ نے سرکار نظام کو خود اس کا زبردستی چھینا ہوا ملک واپس کر دیا تو اس کو مشکل ہی سے "انعام" کہا جا سکتا ہے۔ انگریزی حکومت نے نواب افضل الدولہ بہادر پر یہ اثر جمانے کی کوشش تو ضرور کی تھی کہ یہ سب کچھ ان کی بیش قیمت خدمات کے صلہ میں انعام کے طور پر دیا جا رہا ہے لیکن کرنل ڈیوڈسن سے گفتگو میں انہوں نے صاف طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا کہ جو کچھ ان کا تھا وہی ان کو دیا جا رہا ہے۔[۲] خود انصاف پسند انگریزوں نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں انگریزی حکومت نے نظام کو جتنا فائدہ پہنچایا اس سے زیادہ خود حاصل کر لیا۔ چنانچہ ۳۰ اپریل ۱۸۶۰ء کے ایک لیڈنگ آرٹیکل میں ٹائمز آف انڈیا نے صاف لکھا تھا کہ:-

"معاہدہ کی گفت و شنید میں ہم نے بہت سے فوائد حاصل کر لیے، اس معاملہ سے جو لوگ بہتر واقفیت رکھتے ہیں ان کا قول ہے کہ ۱۸۵۳ء کے ضمنی معاہدہ میں منافع و فوائد کے ترازو کا پلڑا ہماری طرف زیادہ جھکا ہوا تھا۔"

۱۔ Hydarabad affairs Vol. II. P. 260

۲۔ " " " P. 420

سر سالار جنگ کا مطالبۂ استرداد برار

سر سالار جنگ مرحوم جو معاہدۂ تفویض برار کے ایک ہی ہفتہ بعد اپنے چچا سراج الملک کی جگہ مدار المہام بنائے گئے تھے، اپنے خاندان کی پیشانی پر اسکو بڑا داغ سمجھتے تھے، کہ اس کے ایک فرد کی وزارت میں ملک برار دولت آصفیہ کے قبضہ سے نکلا ہے، ایک مرتبہ انہوں نے خود انگریزی ریزیڈنٹ کرنل لومسڈن (Lumsden) سے کہا تہا کہ۔

"ان اضلاع کی تفویض کا واقعہ میرے چچا کی زندگی کے آخری لمحوں میں پیش آنے سے والی ملک اور اہل ملک دونوں کی نظروں میں میرے خاندان کی رسوائی ہوئی ہے، اعلی حضرت مغفرت مکاں نے بارہا مجھ سے فرمایا تہا کہ ان اضلاع کی واپسی کے لئے اپنا سارا زور صرف کردو۔ اور میں نے اُن سے وعدہ کیا تہا کہ اپنے خاندان پر سے اس داغ کو دور کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا"[۱]

یہی خیال تہا جس کی بنا پر ۱۸۵۳ء سے ۱۸۶۰ء تک سات سال کی مدت میں انہوں نے کم از کم چھ مرتبہ واپسی برار کی درخواست کی[۲]، مگر یہ درخواست چونکہ محض درخواست تھی، اس میں مطالبہ کا زور نہ تہا۔ اس لئے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اور ۱۸۶۰ء میں مفوضہ علاقہ کا کچھ حصہ واپس کر کے ان کی اشک شوئی

۱۔ Hydarabad affairs vol. 11. P. 356

۲۔ " " " P. 380

کردی گئی۔ لیکن سالار جنگ اس سے مطمئن ہونیوالے نہ تھے۔ وہ اس مطالبہ کے لئے ایک اچھے موقع کے منتظر تھے، اور وہ موقع میسور کے واقعات نے انکو بہم پہنچا دیا۔

۱۷۹۹ء کی جنگ میسور میں جب ٹیپو سلطان کی پوری مملکت فتح ہو گئی۔ تو از روے معاہدہ یہ ضروری تہا کہ ملک کو انگریزی حکومت اور سرکار نظام کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دیا جاتا۔ لیکن ایچی سن (Aitchison) کے بقول انگریزی حکومت نے اس خیال سے کہ نظام کی طاقت حد سے زیادہ نہ بڑھ جائے میسور کے اس پرانے شاہی خاندان کو جسے حیدر علی نے بیدخل کر دیا تھا، ڈھونڈ کر نکالا اور ۰۰۰،۷۰،۱۳ ہن کا ملک دیکر تین برس کے ایک بچے کو اس کا راجہ بنا دیا چونکہ یہ ریاست محض نظام کے توڑ پر قائم کی گئی تھی۔ اس لئے انگریزی حکومت کی سیاست کا میلان اسی طرف رہا کہ جب کوئی بہانہ ملے تو اسے مٹا کر سارا ملک انگریزی مقبوضات سے ملحق کر لیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۳۱ء میں مہاراجہ کی فضول خرچی کے بہانہ سے اس میں مداخلت کی گئی، اور ۱۸۳۲ء میں ساری ریاست انگریزی انتظام میں لے لی گئی۔ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ میسور نے اپنے ملک کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ مگر اسے رد کر دیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس نے پھر مطالبہ کیا اور اسے پھر جواب ملا کہ مہاراجہ نہ تو کسی حق کے طور پر ریاست کی بحالی کا مطالبہ کر سکتے ہیں، اور نہ اسے بحال کرنا باشندگان ریاست کے مفاد کے لئے مفید ہو سکتا ہے ۱۸۶۴ء میں مہاراجہ نے ایک لڑکے کو متبنیٰ بنانے کی اجازت مانگی تو اسے بھی

۱؎ Aitchison Vol. IX P. 182-83

رد کر دیا گیا، اور ۱۸۶۸ء میں جب مہاراجہ نے ایک لڑکے کو گود لے لیا تو برٹش گورنمنٹ نے اس کارروائی کو جائز تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

گورنمنٹ کے اس رویہ سے صاف معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے ملک کو ملحق کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے، اس لئے سالار جنگ نے اس موقع کو اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے موزوں خیال کیا۔ اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۶ء کو سر جارج یول (ریزیڈنٹ) کے نام ایک خط لکھا، جس کے اہم نکات حسب ذیل تھے

(۱) ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے وعدہ کیا تھا کہ برار کی آمدنی میں سے جو کچھ بچت ہوگی۔ اسے سرکار نظام کے حوالہ کر دے گی، لیکن معاہدہ کی تکمیل کو چھ سال گذرنے کے باوجود اس سرکار کو ایک پیسہ بھی بچت کا نہیں ملا، اور نہ آیندہ ملنے کی امید ہی کیونکہ برار کی ۵۰ لاکھ آمدنی میں سے ۴۳ لاکھ روپیہ صرف نظم و نسق میں خرچ کر دیا جاتا ہے۔ سرکار نظام اسوقت روپے کی سخت ضرورت مند ہے، اور وہ اس کا حق رکھتی ہے کہ کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کا دوسرا اطمینان بخش انتظام کر کے اپنے ان اضلاع کو واپس لے لے۔

(۲) برٹش گورنمنٹ نے میسور کے علاقہ کو ملحق کر لینے کا ارادہ ظاہر کر دیا ہے اس لئے سرکار نظام کو اس علاقہ میں سے اسی طرح حصہ ملنا چاہیئے جس طرح ۱۷۹۹ء کے معاہدۂ تقسیم میسور میں ملا تھا۔ اگر برٹش گورنمنٹ میسور کی نئی ریاست قائم نہ کرتی تو بلا شک و ریب یہ ملک سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان تقسیم ہوتا۔ جس طرح اس وقت اس ریاست کا قیام سرکار نظام کی موافقت سے ہوا تھا۔ اسی طرح اب اس کا سقوط بھی اگر ہو تو سرکار نظام کی موافقت سے

ہونا چاہیئے

(۳) سنہ ۱۸۰۰ء کے خفیہ معاہدہ کی دفعہ ۳ میں طے ہوا تھا کہ آئندہ جو علاقے دونوں حکومتوں کی متحدہ افواج کی قوت سے فتح ہوں گے، وہ دونوں حکومتوں کے درمیان برابر تقسیم کئے جائیں گے، چنانچہ اسی دفعہ کے ماتحت سنہ ۱۸۱۸ء اور سنہ ۱۸۲۲ء میں سرکار نظام کو پیشوا اور سندھیا کے مفتوحہ علاقوں میں سے حصہ دیا گیا تھا۔ اور اب اسی معاہدہ کے مطابق کرنول اور گومسور کے علاقوں میں سے سرکار نظام کو کم از کم ۱۵۰۰۰۰ روپیہ سالانہ کا حصہ ملنا چاہیئے۔ کیونکہ ان علاقوں کی فتح میں اس سرکار کی فوج شامل تھی۔

(۴) سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی روسے کرنول کا صرف پیش کش تفویض کیا گیا تھا نہ کہ اصل علاقہ۔ از روئے آئین ملک بدستور سرکار نظام کی ملک رہا اور اس کے حق ملکیت کو اس سرکار نے کبھی تفویض نہیں کیا۔ اس لئے اس کی آمدنی (پیشکش کو وضع کرکے) اس سرکار کا حق ہے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے، سرکار نظام کے حقوق حسب ذیل ہیں۔

کرنول کی مالگذاری بوضع پیش کش	۱۷۰۰۰۰۰
گومسور کی مالگذاری میں سرکار نظام کا حصہ	۱۵۰۰۰۰
میسور کی ۸۴ لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کا نصف	۴۱۵۰۰۰۰
جملہ	۶۰۰۰۰۰۰

چونکہ ابھی ریاست میسور کے انقراض کا مسئلہ طے نہیں ہوا ہے، اس لئے فی الحال اسے چھوڑ کر اول الذکر دو علاقوں کا ۱۸۵۰۰۰۰ روپیہ سالانہ کنٹنجنٹ

کے مصارف کے لئے قبول کیا جائے ، اور بقیہ ۸۵۰۰۰ روپے کے لئے ملک میسور کا تصفیہ ہونے تک ہم قابل اطمینان ضمانت مہیا کر دینگے۔ اس انتظام کے بعد ملک برار سرکار نظام کو واپس دیدیا جائے[۱]۔

اس مراسلہ کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ برار کی آمدنی میں سے تقریباً ۱۰ لاکھ روپیہ سال کے ختم ہونے سے پہلے سرکار نظام کو دینے کے احکام جاری ہو گئے، دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۷ء میں مہاراجہ میسور کے گود لئے ہوئے لڑکے کو ان کا وارث تسلیم کر لیا گیا، اور مہاراجہ کے مرنے کے بعد ۲۳ دسمبر ۱۸۶۸ء کو اس لڑکے کی گدی نشینی کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

دوسری طرف سر سالار جنگ کے اس خلاف توقع مطالبہ سے برطانی حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو ریزیڈنٹ نے ایک طویل نوٹ کے ساتھ سالار جنگ کا خط گورنمنٹ آف انڈیا کے پاس بھیجا، اور اس میں بڑی کاوش سے ان کے دلائل کی تردید کی۔ اس کے جواب میں ۱۳ فروری ۱۸۶۷ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکرٹری مسٹر وائی ولما (W. S. Wyllie) نے حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کے نام ایک طویل مراسلہ لکھا، جس کے ابتدائی فقروں میں یہ فقرہ خصوصیت کے ساتھ ان جذبات غیظ و غضب کو ظاہر کرتا ہے جو مال مغصوبہ کی بازطلبی پر غاصبوں کی جماعت میں ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ اس میں لکھا تھا کہ۔

"وائسرائے یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ حکومت حیدرآباد کے موجودہ دعاوی

---

[۱] Hydarabad affairs Vol. 11. P. 652-55

صحیح اور مبنی بر انصاف ہیں۔ کونسل میں ان پر اسی قدر گہرا اور متفکرانہ غور و خوض کیا گیا جسقدر مسئلہ کی اہمیت اور اس سے زیادہ خود ہز ہائی نس کی آزمودہ وفاداری متقاضی تھی۔ گر ہز اکسلنسی نے اس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پایا کہ یہ دعادی کلیتہً بے بنیاد ہیں اور صحت و درستی کا شائبہ بھی ان کی تائید میں موجود نہیں ہے، گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے یہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے کہ کسی دیسی ریاست کی درخواست پر سخت الفاظ میں کلام کرے۔ مگر سر سالار جنگ کے خط میں نعنول ادعا کی جو روح بھری ہوئی ہے، جو ان کے شاہی آقا کے مرتبہ اور خود ان کی شان تدبر دونوں کے خلاف ہے، وہ گورنر جنرل کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہنے دیتی کہ وہ آئندہ کے لئے یہ درخواست کریں کہ دربار حیدرآباد کی خط و کتابت اس سے زیادہ سنجیدگی اور ہوشمندی کے ساتھ ہونی چاہئے"[۱]

فی الواقع یہ تنبیہ تھی بھی معقول، کیونکہ حق طلب کرنا، معاہدات کی پابندی پر زور دینا، اور برسوں کے کھائے ہوئے مال کو اُگلوانے کی کوشش کرنا، یہ سب کے سب نہایت غیر سنجیدہ اور غیر ہوشمندانہ افعال ہیں۔ اور ان کا ارتکاب انگریز کے سوا اگر کوئی اور کرے تو وہ اس کی شاہانہ قدر و منزلت اور مدبرانہ شان دونوں کے عین منافی ہے۔ کیونکہ دوسروں کے لئے تو یہی سزاوار ہے کہ اپنا مال دیں اور پھر پلٹ کر نہ مانگیں۔

ایک طرف سالار جنگ کو یہ جواب دیا گیا۔ دوسری طرف ۱۶ ارفروری ۱۸۶۶ء

---

[۱] Hydarabad affairs Vol. II. P. 656

کو سکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ کرینبورن (Cranborne) کے نام سالار جنگ کا خط ایک طویل نوٹ کے ساتھ بھیجا گیا۔ اور انہیں لکھدیا گیا کہ۔

"ہم پوری احتیاط کے ساتھ تحقیقات کرکے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بیان کردہ قرضوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور چونکہ وہ سمجھوتہ جس کی رو سے برٹش گورنمنٹ نے زیر بحث مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے، اس کی روح ہی یہ ہے کہ ہمارے پاس ان مطالبات کو پورا کرنے کے لئے ایک ایسا مستقل ذریعہ آمدنی ہونا چاہئے جو اس کے لئے کافی ہو، اس لئے ہم نے دربار کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم موجودہ تفویض برار میں کسی ترمیم کے فتح باب کی کوئی وجہ نہیں پاتے"[1]

اس کے جواب میں ۱۳ رمئی ۱۸۶۷ء کو لارڈ اسٹیفرڈ نارتھ کورٹ سکرٹری آف اسٹیٹ نے لکھا کہ۔

"میں اس باب میں آپ کی رائے سے پورا اتفاق رکھتا ہوں کہ اس قرض کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، جس کے متعلق دربار حیدرآباد نے بیان کیا ہے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ذمہ ہز ہائی نس نظام کی طرف سے واجب الادا ہے۔ اور جس کو ہز ہائی نس نے اپنی موجودہ درخواست کی بنیاد قرار دیا ہے"

"اب رہا وہ دعویٰ جو متوقع انقراض ریاست میسور میں برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ حصہ لینے کے متعلق نظام نے پیش کیا ہے، تو برٹش گورنمنٹ یہ تسلیم ہی نہیں کرتی کہ علاقہ میسور میں نظام کچھ حقوق مستلزم الاستعداد رکھتے ہیں، تاہم

---

[1] Hydarabad affairs vol. 11. P. 648

سردست یہ کہدینا کافی ہے کہ سر سالار جنگ کے پیش کردہ دعاوی ایسے مفروضات
و قیاسات پر قائم کئے گئے ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اسلئے ان پر بحث کرنا بالکل غیر ضروری ہے

اس طرح یہ معاملہ یہیں ختم کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد نواب مغفرت مکان افضل الدولہ بہادر کا انتقال ہوگیا، فروری ۱۸۶۹ء میں نواب میر محبوب علی خاں بہادر تین سال کی عمر میں وارث تاج و تخت ہوئے، نواب سر سالار جنگ انکے ایام نابالغی میں مختار ریاست بنائے گئے اور نواب شمس الامرا امیر کبیر کو شریک مختار بنایا گیا، شمس الامرا اور سالار جنگ کے خاندان میں پرانی مخالفت تھی، لیکن دونوں ریاست کے خیر خواہ تھے، اسلئے جہاں تک ریاست کے مفاد کا تعلق تھا دونوں ایک متفقہ پالیسی پر کاربند رہے اور استرداد برار کی طرف دونوں نے اپنی پوری توجہ صرف کی۔

۱۴ فروری ۱۸۶۷ء کے مراسلہ میں گورنمنٹ آف انڈیا نے تفویض برار کے معاہدہ میں ترمیم و تنسیخ کا دروازہ کھولنے سے صرف اس بنا پر انکار کیا تھا کہ گورنمنٹ کو کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ایک "مستقل ذریعہ آمدنی" کی ضرورت تھی۔ اس لئے سر سالار جنگ نے ایک "مستقل ذریعہ آمدنی" مہیا کرنے ہی کی طرف ساری توجہ منعطف کر دی اور آخر کار اپنی اعلیٰ قابلیت سے انھوں نے ۹ کرور روپے کا انتظام کرکے ۱۹ اسمبر ۱۸۷۲ء کو دوبارہ مسئلہ برار کا افتتاح کیا اور گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم کنٹنجنٹ کے مصارف کے لئے ۸ ملین پاؤنڈ کی نقد رقم جمع کرا دیتے ہیں، اور اس طرح وہ "مستقل ذریعۂ آمدنی" گورنمنٹ کے ہاتھ آجاتا ہے جسکی خاطر ملک برار سرکار نظام سے لیا گیا ہے۔ اگر کوئی نیک نیت حکومت ہوتی تو یقیناً اس تجویز کو منظور کر لیتی۔ کیونکہ ۸ ملین پاؤنڈ کا صرف سود ہی کنٹنجنٹ کے سالانہ

مصارف کے لئے کافی تھا۔ لیکن وہاں تو اصل مقصود کنٹنجنٹ نہ تھی، بلکہ برار تھا، اسلئے ۲۴ر ستمبر ۱۸۷۳ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سکریٹری نے ریزیڈنٹ کی معرفت یہ مختصر سا جواب دیدیا کہ "اوّل تو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کو قائم رکھنا یا بدلدینا تنہا حکومت حیدرآباد کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اسکے لئے دونوں حکومتوں کی رضامندی درکار ہے" دوسرے مذکورۂ بالا دونوں معاہدوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ "کنٹنجنٹ کے مصارف کے لئے ارضی ضمانت (territorial guarantee) مہیا کیجائے" چھ سال پہلے تک انہی معاہدوں کی روح صرف یہ تھی کہ "مستقل ذریعۂ آمدنی" برٹش گورنمنٹ کے ہاتھ میں ہو، مگر جب وہ "مستقل ذریعۂ آمدنی" ہاتھ میں دینے کا بندوبست ہوگیا تو اب انہی معاہدوں کا بنیادی اصول یہ مقرر ہوا کہ "ارضی ضمانت" مہیا کیجائے۔

ان حیلوں اور بہانوں کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کا بنیادی اصول محض ملک برار پر انگریزی تسلط تھا اور کنٹنجنٹ کی حیثیت شکاری کے جال کے سوا کچھ نہ تھی۔ حکومت کے اس رویہ پر خود انڈین کونسل کے بعض ممتاز ارکان نے سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی اور سرجان کے (Sir John Kaye) نے تو یہاں تک لکھدیا کہ جو طرز عمل گورنمنٹ اختیار کررہی ہے اس نے ہندوستان کی تمام بڑی بڑی ریاستوں کو یہ یقین دلادیا ہے کہ جو پالیسی ہم نے اپنی کمزوری کے زمانہ میں اختیار کی تھی اسے اب ہم اپنی طاقتوری کے زمانہ میں بدل رہے ہیں اور آخر میں اس نے لکھا تھا کہ:-

"اس روش میں سلطنت کے لئے شدید خطرات مضمر ہیں جنکو میں اپنے ۲۰ سال کے تجربہ کی بنا پر نمایاں دیکھتا ہوں" ؎۵

لیکن یہ سب تنبیہیں بیکار تھیں۔ حکومت برطانیہ کے ارباب حل وعقد کی نگاہ میں ملک برار کی قیمت ان نصائح کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔

حکومت ہند کے اس انکاری جواب پر ۲۴ر نومبر ۱۸۷۳ء کو سالار جنگ اور شمس الامرا نے ریزیڈنٹ کے نام ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے حکومت کے جواب پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگرچہ سرکار نظام کسی جائز معاہدہ کی بنا پر کنٹنجنٹ رکھنے کی پابند نہیں ہے، تاہم وہ برٹش گورنمنٹ کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے طیار ہے اور صرف یہ چاہتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ باہمی اتفاق کے ساتھ اس امر پر غور کرے کہ "ارضی ضمانت" کے بجائے نقد مالی ضمانت کو قبول کرنے میں کیا قباحت ہے۔

اس مراسلہ کو کلکتہ کے دفتر سیاسیات نے اس طرح نذر تغافل کر دیا جیسے کہ وہ وصول ہی نہیں ہوا، اور ۹ر مارچ ۱۸۷۴ء کو لارڈ سالسبری (وزیر ہند) سے یہ مختصر سا فیصلہ حاصل کر لیا کہ اضلاع کی مدت تفویض کو متعین کرنا تنہا حکومت حیدر آباد کے اختیار میں نہیں ہے، اور ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کا اصلی مقصد ارضی ضمانت حاصل کرنا تھا۔ وزیر ہند کا یہ فیصلہ ۱۲ر مئی ۱۸۷۴ء کو حکومت حیدر آباد کے پاس بھیجدیا گیا۔

اس کے جواب میں ۶ر جولائی ۱۸۷۴ء کو سر سالار جنگ اور شمس الامر

؎۵ Hyderabad affairs Vol. II. P. 383

نے ایک اور طویل مراسلہ بھیجا جو ۱۲۴ پیراگراف پر مشتمل تھا۔ اور اس میں انھوں نے کنٹنجنٹ کی حقیقت، اس کے قرض کی اصلیت، اور ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی غیر قانونی نوعیت کو واضح کرنے کے بعد گورنمنٹ کو صاف طور پر مطلع کر دیا کہ محض برٹش گورنمنٹ کو خوش رکھنے کے لئے ہم اس کنٹنجنٹ کو برقرار رکھنے پر راضی تھے اور اس کے مصارف کیلئے ۸۰ ملین پونڈ کی رقم خطیر پیش کر رہے تھے، لیکن اگر ہمارے اس فیاضانہ پیشکش کو رد کیا جاتا ہے تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ کرنل لو کے اُس وعدہ پر اپنے مطالبات کو قائم کریں جو ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے وقت انھوں نے حکومت ہند کی جانب سے کیا تھا کہ تفویض صرف اس وقت تک کے لئے ہے جب تک سرکار نظام کو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہیگی۔ لہذا اب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کنٹنجنٹ کی ضرورت نہیں ہے، آپ اسے برطرف کیجئے اور ہمارا ملک ہمیں واپس دیجئے۔[1]

یہ برٹش گورنمنٹ کے غاصبانہ حیلوں کا اصلی جواب تھا، اور اس جواب کو صبر و سکون کے ساتھ سننا گورنمنٹ کی قوت ضبط سے باہر تھا۔ کلکتہ کے صیغۂ خارجیہ نے اس مراسلہ کو دبا کر رکھ لیا وزیر ہند کو اس کی خبر تک نہیں کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ ایک آخری جواب دیکر اس معاملہ کو ختم کر دیں۔ چنانچہ حکومت ہند کی درخواست پر لارڈ سالسبری نے ۱۷ جولائی ۱۸۷۴ء کو سر سالار جنگ کے مطالبات کا یہ قطعی جواب دیدیا کہ نہ ملک برار

---

[1] Hyderabad affairs Vol. III 858-59

واپس کیا جائے گا اور نہ کنٹنجنٹ کے لئے مالی ضمانت قبول کیجائے گی۔ یہ جواب سر سالار جنگ کے ۱۰ رجولائی والے خط کے بعد اس کے علم کے بغیر لکھا گیا تھا، اور اُس کے جواب میں بالکل بے معنی تھا، لیکن ریزیڈنٹ نے اس راز کو چھپانے کے لئے کہ یہ "قطعی فیصلہ" ۱۰ رجولائی والے خط کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے، اسے ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ تک دبائے رکھا، اور ۲۱ راگست ۱۸۷۴ء کو امرائے حیدر آباد کی ایک دعوت کرکے اسمیں سر سالار جنگ اور شمس الامرا کو زبانی اس فیصلہ کا خلاصہ سُنا دیا اور صاف الفاظ میں یہ بھی کہدیا کہ اس فیصلہ کے بعد اب میں مسئلہ برار کے متعلق کوئی خط حکومت ہند کو بھیجنے کیلئے وصول نہیں کرونگا۔ سالار جنگ نے لارڈ سالسبری کے مراسلہ کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر ریزیڈنٹ نے انکار کر دیا۔ دوسرے دن سالار جنگ نے سرکاری طور پر وزیر ہند کے مراسلہ کی نقل طلب کی مگر اسکا بھی وہی جواب تھا جو زبانی درخواست کا دیا جا چکا تھا۔ اسپر سر سالار جنگ نے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۴ء کو ایک پرزور خط ریزیڈنٹ کے نام لکھا جسمیں انھوں نے صاف لکھدیا کہ۔

اُس جواب کا مطلب تو یہ ہے کہ سرے سے یہ بحث ہی کرنے سے انکار کیا جا رہا ہے کہ ہمارے دعاوی صحیح ہیں یا غلط، اور ان کی صحت و عدم صحت کا امتحان کئے بغیر ان کو زبردستی دبا دینے کی کوشش کیجا رہی ہے۔۔۔۔۔ سکرٹری آف اسٹیٹ کا فیصلہ جس کو آخری فیصلہ کہا جا رہا ہے، ہمارے

۵۔ Hydarabad affairs. Vol. II. PP. 385-86

اصلی دعاوی اور دلائل کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہے، اور دراصل وہ ہمارے
اس خط کا جواب ہے جو ۱۰ر جولائی والے خط سے پہلے بھیجا گیا تھا۔"

ریزیڈنٹ نے سر سالار جنگ کے اس خط کو حکومت ہند کے پاس بھیجنے سے انکار کر دیا اور ۱۲ر اکتوبر کو اسے ان الفاظ کے ساتھ واپس کر دیا کہ وائسرائے کی واضح ہدایات یہ ہیں کہ اب میں اس مسئلہ کے متعلق انہیں کوئی مراسلہ نہ بھیجوں۔ سر سالار جنگ نے ۱۵ر اکتوبر کو پھر وہی خط ریزیڈنٹ کے پاس بھیجا اور اسے لکھا کہ اس ریاست کی طرف سے جو فرائض مجھ پر اور میرے رفیق کار پر عائد ہوتے ہیں، وہ ایک ایسے فیصلہ کو "آخری فیصلہ" تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتے جو ہمارے دعاوی کے حسن و قبح کو جانچے بغیر، بلکہ نفس دعاوی کو دیکھے بغیر صادر کیا گیا ہو۔ دوسرے دن ریزیڈنٹ نے اس مراسلہ کو ایک نہایت خشمناک خط کے ساتھ سر سالار جنگ کے پاس واپس بھیجدیا جس میں لکھا تھا کہ۔

"اس طرح کا پیہم اصرار پرائیویٹ اور سوشل تعلقات میں بھی ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اور سرکاری معاملات میں تو اس سے کوئی اچھا نتیجہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کا راست نتیجہ یہ ہوگا کہ ان عمدہ تعلقات پر برا اثر پڑے گا جو نظام کی نابالغی کے زمانہ میں حکومت ہند آپ سے اور امیر کبیر سے برقرار رکھنا چاہتی ہے۔"[۵۱]

ایک طرف اس طریقہ سے سر سالار جنگ کا منہ بند کیا گیا اور دوسری طرف

---

۵۱ Hydarabad affairs vol. 11. P. 387

انگریزی حکومت نے اپنے اس قدیمی دوست کے اثر کو کم کرنے کے لئے سازش شروع کر دی۔ سر سالار جنگ کو برطانی حکومت کا وفادار دوست اس بنا پر سمجھا جاتا تھا کہ ان سے برطانی حکومت کو یہ اُمید تھی کہ وہ اپنے ملک اور اپنے آقا کی سلطنت سے غداری کرینگے۔ مگر جب انھوں نے ایک نمک حلال خادم دولت کی حیثیت سے اپنے آقا کے جائز حقوق طلب کرنے شروع کئے تو وہی سالار جنگ سلطنت برطانیہ کے دشمن ہوگئے اور انگریزی حکومت نے ان کو اس طرح حیدرآباد کی حکومت سے نکالدینا چاہا جس طرح انگلی میں سے پھانس نکالدی جاتی ہے۔ اس غرض کے لئے انگریزی ریزیڈنٹ مسٹر سانڈرس نے ریزیڈنسی میں امرائے حیدرآباد کو کھانے کی دعوت دی، اس میں ان لوگون کو خاص طور پر بلایا جو سالار جنگ کے سخت مخالف تھے، اور ان سے درخواست کی کہ وہ سالار جنگ اور شمس الامرا کو ان کی "نازیبا" حرکات سے باز رکھیں۔ لیکن اس ریشہ دوانی میں مسٹر سانڈرس کو ناکامی ہوئی اور تقریباً تمام اکابر دولت نے اس کو یقین دلادیا کہ برار کے مسئلہ میں وہ سب مختار الملک اور ان کے رفیق کے موید ہیں۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف سالار جنگ نے اپنے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۲ء والے خط میں اشارہ کیا ہے کہ۔

"ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ اس ریاست کا کوئی وفادار خادم جو ہماری طرح اس دعوے کی قوت و صداقت کو محسوس کر چکا ہو، اور ہماری سی ذمہ داری کا حامل ہو، اعلیٰ حضرت کے متعلق اپنے فرائض کا احساس

رکھنے کے باوجود ہمیں یہ مشورہ دے گا کہ اس دعوی سے دست بردار ہو جانا چاہیئے۔"[۱]

سالار جنگ کو ریزیڈنٹ کے رویہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ انگریزی حکومت ان سے سخت ناراض ہے، مگر انھوں نے اس ناراضی کی ذرہ برابر پرواہ نہیں کی اور اپنے دعوے کو آگے بڑھانے کے لئے یہ غیر معمولی طریق کار اختیار کیا کہ ۷ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو براہ راست وزیر ہند کے پاس اپنے کاغذات بھیج دیے اور انھیں اس سے بھی مطلع کر دیا کہ ریزیڈنٹ اور حکومت ہند کے کس غیر معقول طرز عمل نے ان کو یہ غیر معمولی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے لارڈ سالسبری کم از کم اتنے بدتمیز نہ تھے کہ مسٹر سانڈرس کی طرح ایک مقتدر ریاست کے وزیر اعظم کے منہ پر ان کا غذات کو کھینچ مارتے۔ انھوں نے معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر کاغذات رکھ لئے اور حکومت ہند کو ہدایت کی کہ وہ سر سالار جنگ کے دلائل کا جواب دے اور خصوصیت کے ساتھ اس استدلال کا جواب دے کہ "صریح مواعید کی بنا پر کنٹنجنٹ کا برقرار رکھنا یا اسے برطرف کر دینا نظام کی اپنی مرضی پر موقوف ہے" لیکن حکومت ہند کے پاس دلائل کا کچھ جواب نہ تھا۔ وہ غیر متعلق کاغذات بھیج بھیج کر وزیر ہند کا وقت ضائع کرتی رہی، اور اصل بنیادی نکات کا جواب دینے سے احتراز کرتی رہی یہاں تک کہ پورا ایک سال گزر گیا اور سالار جنگ کو وزیر ہند کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار سر سالار جنگ نے اس قضیہ کو طے کرنے کیلئے انگلستان جانیکا

---

[۱] Hydarabad affairs Vol. 11. P. 359

عزم کر لیا اور ۱۸۷۶ء میں وہ ملک کا انتظام اپنے رفیق کے سپرد کر کے خود یورپ روانہ ہو گئے۔ حکومت ہند کے لئے یہ ایک مشکل صورت حال تھی۔ سالار جنگ کو سفر سے روکنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اور یہ بھی گوارا نہ تھا کہ وہ وزیر ہند کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کر کے اس معاملہ کو طے کر لیں۔ اس لئے اس نے اس مشکل کا یہ حل تلاش کیا کہ سفر انگلستان میں سالار جنگ وزیر ہند سے برار کے متعلق کوئی گفت و شنید نہ کریں اور اس کے عوض اس رسمی مراسلت کے دروازہ کو کھول دیا جاتے جو ۱۸۷۴ء میں ریزیڈنٹ نے بند کر دیا تھا۔ چنانچہ اس سمجھوتہ کو قبول کر کے سر سالار جنگ نے انگلستان میں برار کے متعلق کوئی گفت و شنید نہیں کی اور واپس آ کر دسمبر ۱۸۷۶ء میں اپنے دعاوی اور دلائل کے متعلق ایک مفصل بیان ریزیڈنٹ کے پاس بھیجا تا کہ وہ اسے حکومت ہند کے پاس بھیجدے لیکن ریزیڈنٹ نے حسب سابق اس میموریل کو وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

جنوری ۱۸۷۷ء کے دربار میں جب سالار جنگ نواب میر محبوب علی خاں مرحوم کو لیکر دہلی گئے تو کلکتہ کے صیغۂ خارجیہ سے حکم آیا کہ جبتک سالار جنگ اور شمس الامرا دونوں اس مضمون کے اقرار نامہ پر دستخط نہ کر دیں کہ وہ حکومت آصفیہ پر دولت برطانیہ کی سیادت کو تسلیم کرتے ہیں اسوقت تک دربار حیدرآباد کو شاہی اجتماع میں شامل نہ کیا جائے[1]۔ اس کے ساتھ ہی

---

[1] سر سالار جنگ نے معاہدات کی بنا پر یہ دعوی کیا تھا کہ دولت آصفیہ ایک آزاد و خود مختار ریاست ہے جسپر سلطنت برطانیہ کو حقوق سیادت حاصل نہیں ہیں، بلکہ دونوں سلطنتوں کے تعلقات [illegible] اتحاد پر مبنی ہیں۔ سر سالار جنگ نے دونوں کے تعلقات میں بین المللی قانون کے نفاذ [illegible]

ان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ وہ دولتین کے مابین نزاعی امور میں وزیر ہند کے فیصلہ کو قطعی و آخری فیصلہ تسلیم کریں۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے سالار جنگ نے ان دونوں شرطوں کو منظور کر لیا۔ تب جاکر انھیں دربار میں شرکت کی اجازت دی گئی اور انکے اس میموریل کو قبول کیا گیا جسے دسمبر میں واپس کر دیا گیا تھا۔

اسکے چند مہینے بعد اپریل ۱۸۷۷ء میں شمس الامرا امیر کبیر کا انتقال ہو گیا اور سالار جنگ کا زور توڑنے کے لئے انگریزی حکومت کو وہ موقع مل گیا جسکی وہ منتظر تھی سالار جنگ کی خواہش تھی کہ ریجنسی تنہا انکے ساتھ مخصوص رہے اور سلطنت کے چاروں معین المہامون کی ایک اکزکٹیو کونسل بنادی جائے لیکن ریزیڈنٹ سر رچرڈ میڈ (Sir Richard meade) اور وائسرائے لارڈ لٹن کے درمیان کچھ اور ساز باز ہو رہا تھا۔ کئی مہینہ تک مواد طیار ہوتا رہا اور آخر ۲۸ اگست ۱۸۷۷ء کو سر رچرڈ میڈ نے سالار جنگ کو اطلاع دی کہ وائسراے نے نواب وقار الامرا کو شریک مختار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سالار جنگ اور وقار الامرا میں شدید ذاتی عداوت تھی اور وہ ان سے ملکر کام نہیں کر سکتے تھے اسلئے انھوں نے اس فیصلہ کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسپر سر رچرڈ میڈ سیدھے وائسرائے کے پاس پہنچے اور وہاں سے واپس آکر انھوں نے ایک نیم سرکاری ذریعہ سے سالار جنگ کو مطلع کیا کہ وائسرائے سے پوری طرح اجازت لے لی گئی ہے۔ اب اگر آپ نے ان کے آخری قطعی فیصلہ کو قبول نہ کیا

تو آپ کو گرفتار کر کے ایک اسپیشل ٹرین کے ذریعہ مدراس بھیجدیا جائیگا۔[1] اس دہمکی کے بعد مزید مقاومت کرنا سالار جنگ کے لئے نا ممکن تھا۔ مجبوراً انھوں نے "فیصلہ" کے آگے سر جھکا دیا اور ۲۹ ستمبر ۱۸۷۷ء کو وقار الامرا کو شریک مختار بنا دیا گیا۔

یہ وہی سالار جنگ تھے جنکے متعلق ۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء کے مراسلہ میں لارڈ اسٹینلے نے بحیثیت وزیر ہند یہ حکم دیا تھا کہ ان کا نام غدر کے وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا جائے۔ اور یہ وہی سالار جنگ تھے جنکے متعلق ۲۹ مارچ ۱۸۵۸ء کے ایک مراسلہ میں حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن نے لکھا تھا کہ۔

"نظام کے وزیر نے جس بے دریغ مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ حکومت انگلشیہ کی اعانت کی ہے وہ تعریف و توصیف سے بالاتر ہے ......
ہر خطرہ کے وقت میں ہماری علانیہ امداد کا تہیہ کر لینے سے وہ مسلمانوں میں سخت غیر مرغوب بلکہ قریب قریب خارج از ملت سے ہو گئے تھے۔
مگر نہ کیسی قسم کی ملامتیں اور دہمکیاں، اور نہ التجائیں اور استدعائیں ان کو اس سچی وفاداری کے راستہ سے ہٹا سکیں جو انہوں نے اول دن سے اختیار کیا تھا۔ بیسیوں مرتبہ ان کے قتل کی سازشیں کی گئیں اور مجھے یقین ہے کہ خود ان کو ان سازشوں کا علم تھا۔ مگر نہ تو جان کا خوف ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکا اور نہ ان اطلاعات نے

---

[1] Hydarabad affairs Vol. 11. P. 392

انھیں متزلزل کیا جو شمال مغرب سے ہماری شکستوں کے متعلق پیہم موصول ہو رہی تھیں۔ جب کبھی میں نے ان سے مدد طلب کی تو انھوں نے اسی استقلال اور یکدلی کے ساتھ اسکو پورا کیا۔ اور حکومت نظام کے وسائل جہانتک انکے اختیار میں تھے، میرے لئے وقف رہے۔"

اس وفاداروں کے وفادار اور سرگرم مددگار کو آج گرفتاری اور جلاوطنی کی دھمکی دی جارہی تھی، اسپر الزام لگایا جارہا تھا کہ وہ وہابیوں کی سازش میں شریک ہے، افغانستان سے ساز باز کر رہا ہے۔ بغاوت کے لئے فوج تیار کر رہا ہے، خفیہ اسلحہ سازی کے سامان فراہم کر رہا ہے۔ انگریزی اخبارات کے کالم اس پر طعن وتشنیع کے لئے وقف تھے، اور خود وائسرائے لارڈ لٹن کو بھی یہ کہنے میں تامل نہ تھا کہ اس کے عہد حکومت میں سالارجنگ سب سے بڑا "خطرہ" تھا[۱]۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سالارجنگ نے اپنے آقا کے حق نمک کو ادا کرنے کے لئے انگریزی حکومت سے وہ ملک واپس طلب کیا تھا جسے وہ ہضم کر چکی تھی۔

چند الفاظ نواب وقارالامرا بہادر کے متعلق بھی کہنے ضروری ہیں جنکو اس موقع پر شریک مختار کے منصب کے لئے سب سے زیادہ "موزوں" اور "قابل" شخص قرار دیا جارہا تھا۔ یہ شمس الامرا امیر کبیر اول کے صاحبزادے تھے ۱۸۶۸ء میں جب کرنل ڈیوڈسن اور نواب سالارجنگ پر قاتلانہ حملہ

---

[۱] تھارن ٹن نے سر رچرڈ میڈ کی سوانحعمری میں لٹن کے اس خط کا حوالہ دیا ہے

ہوا تھا، تو ان پر شبہ کیا گیا تھا کہ قاتل کی پشت پر ان کا ہاتھ ہے ۱۸۶۱ء میں ایک اور سازش کے سلسلہ میں ان پر برٹش گورنمنٹ کا عتاب نازل ہوا تھا اور سرکاری درباروں میں ان کا داخلہ تک بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۶۹-۷۰ء کی ایڈمنسٹریشن رپورٹ میں مسٹر سانڈرس (ریزیڈنٹ) انکے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"۸ سال پہلے امیر کبیر کے بھائی نواب وقار الامرا ایک ایسی سازش میں شریک ہونے کے مجرم قرار دئے گئے جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ خود اپنے لئے وزارت کا منصب حاصل کریں۔ اسلئے حکومت عالیہ کے احکام کے ماتحت ان کو ہر ایسے پبلک اجتماع کے موقعہ پر (جس سے خود نظام کا دربار بھی مستثنیٰ نہ تھا) شریک ہونے سے روک دیا گیا جس میں برطانی حکومت کا نمائندہ موجود ہو۔ یہ حکم سزا سیاسی اعتبار سے کامل موت کا ہم معنی تھا"[۵]

چار پانچ سال پہلے تک جس شخص پر "سیاسی موت" طاری رکھی گئی تھی، اور جس کا سرکاری اجتماعات میں داخلہ تک بند تھا، اس پر اب عنایات شاہانہ والطاف خسروانہ کی بارش ہو رہی تھی اور اسکے متعلق برطانی ریزیڈنٹ امرائے حیدر آباد کے بھرے مجمع میں کہہ رہا تھا کہ "وہ ہمیشہ سے برٹش گورنمنٹ اور ہز ہائی نس نظام کی حکومت کے درمیان دوستانہ تعلقات رکھنے کا خواہشمند رہا ہے"۔

اس طرح سالار جنگ کو بے بس کرنے کے بعد ۲۸ مارچ ۱۸۷۵ء کو

۵۔ Hydarabad Affairs Vol. II. P. 360-61

لارڈ سالسبری کی جانب سے سالار جنگ کے اس میموریل کا جواب بھجوایا گیا جو انھوں نے جون ۱۸۸۲ء کو بھیجا تھا۔ اس جواب میں کنٹنجنٹ کے وجود اور اس کی برطرفی کے مسئلہ کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا گیا، کرنل لو کی معرفت سرکار نظام سے جو وعدہ کیا گیا تھا، اس سے بھی کوئی بحث نہیں کی گئی، اور تمام دلائل کا صرف یہ جواب دیا گیا کہ۔

"اس وقت ان اسباب اور محرکات کے متعلق تحقیقات کرنا جو ۱۸۵۳ء کا معاہدہ کرنے والوں کے لئے باعث تحریک ہوتے تھے، فضول ہے۔ یہ واقعہ کہ اس پر دستخط کئے گئے اور وہ ان لوگوں کے لئے واجب التعمیل ہے جنھوں نے اسپر دستخط کئے، صرف یہی ایک ایسا آدمی واقعہ ہے جس سے ہز میجسٹی کی حکومت کو ایک جانب اور ہز ہائی نس کی حکومت کو دوسری جانب سروکار رکھنا چاہیئے۔"

مگر اس کھلی ہوئی صداقت کشی کے باوجود لارڈ سالسبری سر سالار جنگ کے مدلل دعوے کو کلیۃً رد کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور اس نے صرف اس عذر کی بنا پر اس کو رد کیا کہ "اس قسم کے مسائل کو نظام کی جانب سے چھیڑنا ایسی حالت میں کچھ نامناسب سا ہے جبکہ خود نظام ابھی نابالغ ہیں" اور اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ "اگر ہز ہائی نس امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کرینگے کہ دولتین کے تمام ان معاملات پر جو از روئے معاہدہ طے ہوتے ہیں ایک عام نظر ثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس کی اس درخواست پر غور کرے گی۔"

اگرچہ یہ عذر بھی نہایت غیر معقول تھا۔ جب والی ملک کی نابالغی کے زمانہ میں مختار ریاست تمام معاملات کا نگران ہوتا ہے، تو اس کی جانب سے سیاسی مسائل کو طے کرنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے۔ خود تاریخ انگلستان میں ریجنسی کے ایسے اہم معاملات طے کرنے کی مثالیں تا درالوجود نہیں ہیں، ایڈورڈ ششم کی نابالغی کے زمانہ میں نہایت اہم قانون کلیسا کی تدوین اور ۴ لاکھ کراؤن کے عوض بولون (Bologne) کی واپسی۔ ہنری سوم کی نابالغی کے زمانہ میں میگنا کارٹا کی توثیق اور آخری ریجنسی میں ۱۸۱۴ء کے معاہدہ پیرس کے ذریعہ مالٹا، مارشس، سیلون اور جزائر غرب الہند کا انگریزوں کے ہاتھ آنا یہ سب اسی کی مثالیں ہیں جب ایسے ایسے معاملات ریجنسی کے دور حکومت میں طے ہو سکتے تھے تو حیدرآباد کی ریجنسی سے استرداد برار کے مسئلہ کو طے کرنا کیوں نامناسب تھا؟ تاہم یہی غنیمت ہے کہ لارڈ سالسبری نے لارڈ نارتھ بروک کی طرح گفت و شنید کا دروازہ بالکل بند نہیں کیا اور خود نظام کے لئے اس کی گنجایش رکھی کہ اس دروازہ کو کھٹکھٹا سکیں۔

نواب میر محبوب علی خان مرحوم

نواب سالار جنگ مرحوم سالسبری کا یہ جواب سنکر اس امید پر خاموش

ہو گئے تھے کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان کے سن بلوغ کو پہنچنے میں بھی اب کچھ زیادہ مدت نہ تھی۔ ان کو خیال تھا کہ جب حضور تخت نشین ہو نگے تو انگریزی حکومت کے لئے نابالغی کے عذر کی بھی گنجایش نہ رہے گی۔ لیکن قدرت انگریزی حکومت کے لئے باہم کامیابی کے سامان مہیا کئے جا رہی تھی۔ ابھی اعلیٰ حضرت مرحوم کی تخت نشینی میں ایک سال باقی تھا کہ ۱۸۸۳ء میں نواب سالار جنگ کا انتقال ہو گیا اور انگریزی حکومت کے کارندے اس کوشش میں لگ گئے کہ نواب کی تخت نشینی سے پہلے برار کے قضیہ کا ہمیشہ کے لئے قابل اطمینان فیصلہ کر لیا جائے۔ حیدر آباد کے چالاک ریزیڈنٹ مسٹر کارڈری (Cordary) نے بعض نمک حرام امرا سے ساز باز شروع کر دیا۔ اور ایک عہد نامہ کا مسودہ بھی طیار کر لیا جس پر نوجوان بادشاہ سے دستخط لینے کا ارادہ تھا۔ بلنٹ جو اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے حیدر آباد آیا تھا۔ اپنی مشہور کتاب ہندوستان بعہد رپن (India under Ripon) میں اس سازش کے متعلق لکھتا ہے۔

"ہم نے نہایت آزادی کے ساتھ سیاسی حالت پر گفتگو کی جو یہ تھی چند ہفتوں میں نظام سن بلوغ کو پہنچ جائینگے اسکے لئے ریزیڈنسی کیطرف سے یہ کوشش کیجا رہی ہو کہ ان سے ایک معاہدہ پر دستخط حاصل کئے جائیں جسمیں نظام اور حکومت ہند کے درمیان موجودہ اتحاد کی تجدید کیساتھ ایک دفعہ اس قسم کی بھی ہو جو تمام

پچھلے معاہدات کو منسوخ کر دیتی ہے اور اس طرح صوبہ برار مستقل طور پر انگریزوں کے ہاتھ آجاتا ہے ...... سید حسین (نواب عماد الملک مرحوم) یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ ریزیڈنسی میں طیار رکھا ہے ان کو اس کی ایک نقل یا اس کا خلاصہ دکھایا گیا ہے اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ جب نظام سن بلوغ کو پہنچینگے تو یا تو اس معاہدہ کو ان کی تخت نشینی کے لئے لازمی شرط کے طور پر پیش کیا جائیگا، یا اس سے پہلے ہی اس پر پیشکار کے دستخط لے لئے جائینگے۔ انکا خیال ہے کہ یہ کارروائی قانون کے مطابق کی جا سکتی ہے کیونکہ کونسل آف ریجنسی کو شاہی اختیارات حاصل ہیں۔ اور کونسل جن لوگوں پر مشتمل ہے انمیں ایک تو ضعیف العمر اور غیر مستقل پیشکار ہیں دوسرے خود تخت کے امیدوار خورشید جاہ ہیں اور یہ دونوں ریزیڈنسی کے اثر میں ہیں۔ تیسرے بشیر الدولہ ہیں جنکا کوئی خاص رنگ یا مضبوط کیرکٹر نہیں ہے۔ رہے نوجوان سالار جنگ (یعنی میر لائق علی خاں ابن سالار جنگ اول) سو وہ کونسل میں محض سکرٹری کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے کونسل کے فیصلوں میں ان کی آواز کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔ بہت ممکن تھا کہ اس سازش کو کسی نتیجہ خیز حد تک پہنچا دیا جاتا، مگر اسوقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ رپن تھا جو نارتھ بروک اور لٹن سے مختلف ذہنیت کا آدمی تھا، اسلئے اسکے ماتحت روز روشن میں یہ بے ایمانی نہ کی جا سکی اور برار کا مسئلہ مزید بیس سال کے لئے ملتوی ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت مرحوم نے مسند آرائے سلطنت ہونے کے بعد استرداد برار کے مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور انگریزی حکومت کے ساتھ غایت درجہ کی وفاداری کا اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے افغانستان اور مصر کے مسائل میں اپنی فوجی امداد انگریزی حکومت کو پیش کی۔ ۱۸۸۵ء میں جبکہ روس کا خطرہ بڑھ رہا تھا تو مرحوم نے سرحد کی حفاظت کیلئے ۲۰ لاکھ روپیہ اور ایک کثیر فوج سے حکومت کی مدد کرنے کی خواہش ظاہر کی اور فرمایا کہ اگر ضرورت ہو تو میں بذات خود میدان جنگ میں جاؤنگا۔

اعلیٰ حضرت کے اسی پیشکش سے امپیریل سروس ٹروپس کا تخیل پیدا ہوا ۱۸۹۲ء میں انہوں نے امپیریل گورنمنٹ کی مدد کیلئے ۸۰۰ سواروں کا ایک رسالہ قایم کیا۔ اور دسمبر ۱۹۰۵ء میں برٹش گورنمنٹ سے یہ سمجھوتہ کیا کہ جب کبھی میدان جنگ میں انکی فوج جائیگی تو وہ انگریزی افواج کے قائد اعلیٰ کے ماتحت رہیگی۔

اس وفاداری اور استرداد برار کے حق سے بے اعتنائی کا یہ انعام ملا کہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے خود مسئلہ برار کو چھیڑا، اور انہی ناجائز طریقوں سے جو پہلے ڈلہوزی اختیار کر چکا تھا، برار کا دوامی پٹہ حاصل کر لیا۔ یہ کارروائی جس طریقہ سے عمل میں لائی گئی اس کی صحیح کیفیت ظاہر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ۵۰ سال پہلے کے واقعات سے اس کا سلسلہ از سر نو جوڑا جائے۔

لارڈ کرزن کا دوامی پٹہ

۱۸۵۳ء میں جب تفویض برار کے معاہدہ کی گفتگو کا آغاز کیا گیا تھا، تو

ابتداءً حکومت برطانیہ کا مطالبہ یہ تھا کہ برار کو ہمیشہ کیلئے اسکے حوالہ کردیا جائے
۳۰؍مارچ ۱۸۵۳ء کو لارڈ ڈلہوزی نے مجوزہ معاہدہ کا جو مسودہ کرنل لو کے
نام بھیجا تھا اسکی دفعہ ۲ کے الفاظ یہ تھے۔

مذکورۂ بالا حیدرآباد کنٹنجنٹ کے مصارف کی باقاعدہ ادائیگی کے
لئے ہز ہائی نس نظام اس معاہدہ کے ذریعہ آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی
کو دوامی طور پر وہ تمام اضلاع سپرد اور تفویض کرتے ہیں جنکے نام
اس معاہدہ سے منسلک ضمیمہ میں دئے گئے ہیں۔"

جب یہ مسودہ نواب ناصر الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے سب سے
زیادہ جس چیز کی مخالفت کی وہ یہی "دوامی تفویض" تھی۔ اسکے خلاف انکی ناراضی
اسقدر بڑھی ہوئی تھی کہ "انگریزی سلطنت کی شدید دھمکیوں کے باوجود اسکو
قبول کرنے سے سختی کے ساتھ انکار کرتے رہے اور انگریزی ریزیڈنٹ کو یقین
ہوگیا کہ اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو اعلیٰ حضرت معاہدہ ہرگز نہیں کرینگے۔
تب اس نے "دوامی طور پر" کے الفاظ نکالدیے اور اس شرط پر معاہدہ کیا کہ جب
تک انہیں کنٹنجنٹ کی ضرورت رہیگی اسوقت تک برار انگریزی انتظام میں رہیگا۔
کرنل لو اپنے ۴ مئی ۱۸۵۳ء کے مراسلہ میں لکھتا ہے کہ۔

میں نے جب دیکھا کہ لفظ "دواماً" (in Perpetuity) سے نظام
کی ناراضی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی ہے، اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے
اس لفظ پر زیادہ اصرار کیا تو تمام گفت وشنید ہی ناکام ہوجائیگی، تو میں نے
یہ اعلان کیا کہ اس اسکیم کا یہ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق میری حکومت نے

مجھے آزادی دی ہے کہ اگر ضروری ہو تو اسے بدل دوں - اور میں نے باضابطہ (formally) یہ اعلان کر دیا کہ اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹنجنٹ کی پرورش کی غرض سے محض اسوقت تک کے لئے تفویض کیے جا سکتے ہیں جب تک انہیں اس کی (یعنی کنٹنجنٹ کی) ضرورت رہے، اور مزید برآں میں نے کہا کہ اگر ہز ہائی نس مجھ سے یہ خواہش ظاہر کریں کہ وہ اس فوج کی ضرورت نہیں رکھتے تو گورنر جنرل اس کو بتدریج تخفیف کر کے کلیۃً برطرف کر دینگے ..... اور جب یہ ساری فوج توڑ دی جائیگی، جسمیں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی، تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں - ۵۱

اسطرح تفویض کے محض عارضی ہونے کا اطمینان دلا کر ۱۸۵۳ء میں برار پر قبضہ حاصل کیا گیا تھا جب یہ ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا تو سات سال بعد اس مقصد کی جانب دوسرا قدم بڑھایا یا گیا ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ کی گورنمنٹ نے نواب افضل الدولہ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ملک برار کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے کی اجازت دیدیں - اور ملک کی آمدنی میں سے منافع کا مطالبہ ترک کر دیں - سر سالار جنگ نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ اگر ایسا کیا گیا تو تفویض برار کی بالکل وہی حیثیت ہو جائیگی جو بلاری کے علاقہ کی ہے - اور اسطرح "الحاق" اور "تفویض" میں کچھ فرق نہ رہیگا - اس معقول اعتراض کا حکومت ہند کے پاس کوئی جواب نہ تھا اسلئے - اس نے تحریص و اطماع سے کام نکالنے کی کوشش کی اور سرکار نظام کو ریزیڈنٹ کی معرفت لکھا کہ ۵۲

---

۵۱ Hyderabad affairs Vol II. P. 605

۵۲ کرنل ڈیوڈسن کا مراسلہ مورخہ ۱۲ اگست ۱۸۶۰ء نمبر ۶ صیغہ خارجہ

گورنر جنرل باجلاس کونسل ان اضلاع کو کلیتہً نظام کے مقبوضات کا ایک حصّہ سمجھتے ہوئے اور برٹش گورنمنٹ کے کسی ضلع میں انکو ضم کرنے سے احتراز کرتے ہوئے، محض انتظامی آسانی اور خرچ کی کفایت کیلئے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کمشنر ناگپور کی نگرانی میں دیدیں۔ اس طریقہ سے جوڈیشل کمشنر کا عہدہ توڑ دیا جاسکیگا، اضلاع معوفہ کے انتظام کے لئے دوسرا عملہ جو حیدرآباد میں رکھا جاتا ہے اسے بھی موقوف کیا جاسکیگا اور بہت سی دوسری تخفیف مصارف سے متعلق اصلاحیں عمل میں لائی جاسکینگی" ۵۱

لیکن اس اطماع کا بھی حضور نظام پر کچھ اثر نہ ہوا اور جب ان پر زیادہ زور ڈالا گیا تو انہوں نے صاف کہا کہ تم ہمیں ایسے امور کو قبول کرنے پر مجبور کرتے ہو جنکو ہم نہیں چاہتے، اور ملکہ معظمہ کے اعلان کے باوجود تمہاری حکومت ہمارے ساتھ پھر وہی جابرانہ سلوک کرنا چاہتی ہے جسکی بدولت اس سے پہلے ہم سالہا سال تک مالی مشکلات میں مبتلا رہے ہیں ۵۲۔ انگریزی حکومت تہیہ کر چکی تھی کہ مرجان میلکم کی پرانی اسکیم کے مطابق برار، ناگپور، ساگر اور نربدا کے علاقوں کو ملا کر ایک صوبہ متوسط قائم کردے، اور یہاں تک طے ہوچکا تھا کہ اس جدید صوبہ کا پہلا لفٹننٹ گورنر حکومت ہند کے معتمد امور خارجہ مسٹر سیسل بیڈن کو بنایا جائے مگر جب دیکھا کہ نظام اس نقطہ پر اتنی سختی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں کہ تخویف وترہیب کے بغیر اپنی مرضی وخوشی سے اسکو نہ چھوڑینگے ۵۳ تو حکومت ہند نے

---

۵۱ مسٹر بینگ ڈپٹی سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء نمبر ۲۸۸۹ صیغہ خارجہ۔ ۵۲ کرنل ڈیوڈسن کا مراسلہ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۰ء نمبر ۱۹ صیغہ خارجہ
۵۳ ایضاً

کسی دوسری فرصت کے لئے اس ارادہ کو ملتوی کردیا اور بلاواسطہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے بجائے، بالواسطہ حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔

یہ بالواسطہ حصول مقصد کا طریقہ یہ تھا کہ آمد و خرچ کا حساب پیش کرنے کی شرط جو ۱۸۵۳ء میں لگائی گئی تھی، اڑادی گئی اور حکومت کیلئے اس حق کو محفوظ کرلیا گیا کہ وہ برار کی آمدنی میں سے جتنا چاہے خرچ کرے۔ چنانچہ ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کے صیغۂ خارجیہ کی جانب سے یہ تصریح کردی گئی کہ:۔

گورنر جنرل باجلاس کونسل اس بات پر راضی ہیں کہ اضلاع مفوضہ کی آمدنی میں سے نظم و نسق کے مصارف اور وہ اخراجات جو اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ وضع کرکے جو کچھ رقم بچے وہ سرکار نظام کو ادا کردے، مگر یہ رضامندی صرف اس مفاہمت پر ہے کہ اس امر میں برٹش گورنمنٹ کے لئے پھیلاؤ کی زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھی جائے گی، اور ان اضلاع کے نظم و نسق کیلئے تمام وہ اخراجات جنہیں گورنمنٹ کے عہدہ دار مناسب اور ضروری سمجھیں گے۔ انہیں قبل اس کے کہ کوئی فاضل باقی سرکار نظام کو ادا کیا جائے، اس میں سے وضع کرلیا جائیگا اور سرکار نظام کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا، اور اگر ایک سال آمدنی سے خرچ زیادہ ہونے کے باعث گھاٹا آیا تو اسے دوسرے سال کی بچت سے پورا کرلیا جائیگا"[۵۱]۔

اس شرط کو سرکار نظام نے طوعاً کرہاً منظور کرلیا اور ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی دفعہ چہارم

---

[۵۱] مشر ٹینگ کا مراسلہ نمبر ۵۵۷ صیغۂ خارجہ۔

میں یہ بات طے کر لی گئی کہ:۔

"اخراجات کی مقدار کلیۃً برٹش گورنمنٹ کے اختیار تمیزی پر منحصر رہیگی"۔[۵۱]

اس شرط کو منظور کرا لینے کے بعد یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ برار کے خزانہ سے جہاں تک ممکن ہو گا نظام کو بچت کا ایک پیسہ نہ دیا جائیگا۔ معاہدہ طے ہوتے ہی دوسرے سال سے کنٹجنٹ کے اخراجات تقریباً دوگنے کر دئے گئے، ڈلہوزی کے زمانہ میں تو صرف ۳۸ لاکھ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے، اب انکو بڑھا کر ۴۱ لاکھ کر دیا گیا حالانکہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان ۲۴ لاکھ سے زیادہ نہ تھے، نظم ونسق کے مصارف ۲۵ فی صدی سے بڑھ کر ۳۲ فی صدی ہوئے، پھر ۵۰ فی صدی اور آخر ۵۶ فی صدی تک ان کو پہنچا دیا گیا۔ ۱۷۰۰۰ مربع میل رقبہ اور ۲۸۹۰۰۰۰ کی آبادی رکھنے والے صوبہ کا عملہ اس زمانہ میں صوبہ مدراس کے برابر تھا جسکی آبادی ۳ کروڑ ۸۲ لاکھ تھی اور جس کے حدود ڈیڑھ لاکھ مربع میل پر محیط تھے۔ اس چھوٹے سے صوبہ کو ۶ اضلاع پر تقسیم کیا گیا تھا اور ہر ضلع میں ایک کلکٹر ۱۵ مددگار اور ۲ زائد مددگار رکھے گئے تھے اور اسی نسبت سے دوسرے محکموں میں بھی انتہا درجہ کی دریا دلی کے ساتھ فضول عملہ رکھا گیا تھا جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یار وفادار کو اسوقت تک ایک پیسہ نہ ملے جبتک وہ اپنے ملک کو کمشنری ناگپور سے ملحق کرنے پر راضی نہ ہو جائے!

برار کی آمدنی ۱۸۶۰ء تک ۲۶ لاکھ تھی، دوسرے سال ۴۰ لاکھ ہو گئی ۱۸۸۰ء میں ۷۳ لاکھ ہوئی اور ۱۸۹۵ء میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی۔ لیکن اتنی

۵۱ Aitchison vol. ix. P.105

حیرت انگیز توفیر کے باوجود ۱۸۶۷ء سے ۱۹۰۲ء تک جو بچت کی رقم سرکار نظام کے لئے نکالی گئی اس کا اوسط ۹ لاکھ سے زیادہ کبھی نہ بڑھا۔ بلکہ ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان تو صرف ۷ لاکھ کا اوسط رہا اور ۱۸۹۸ء میں ایک پائی کی بھی بچت نہ نکالی گئی۔ پھر مزید یہ کہ برار کی آمدنی میں سے ۵۰ لاکھ کی ایک رقم خطیر اتفاقی ضروریات کے لئے محفوظ بھی کر لی گئی، حالانکہ اسے ملک کے اصل مالک کے خزانہ میں پہنچنا چاہئے تھا۔

۱۸۹۷ء میں جب برار کی نئی جمعبندی ہونے والی تھی اور یہ امید تھی کہ اسمیں اس صوبہ کی آمدنی ایک کروڑ ۱۴ لاکھ ہو جائیگی، تو یہ تجویز پیش کی گئی کہ کنٹنجنٹ کے مصارف ۳۵ لاکھ اور نظم و نسق کے مصارف ۵۰ لاکھ رکھ کر سرکار نظام کے لئے ۳۱ لاکھ کی بچت نکال لی جائے لیکن اس تجویز کو انگریزی حکومت کے سرکاری حلقوں میں سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اور یہ تجویز جہاں سے نکلی تھی وہیں دفن ہو گئی۔

ان پیہم حق تلفیوں پر جب سرکار نظام کی طرف سے شکایت کی گئی تو مئی ۱۸۹۹ء میں لارڈ جارج ہیملٹن (وزیر ہند) نے اس طرف توجہ کی اور حکومت ہند کو لکھا کہ :-

میں اس صورت حال کو قابل اطمینان نہیں سمجھ سکتا اور یور اکسلنسی کی حکومت کی خاص توجہ کے لئے اس معاملہ کو بدیں غرض پیش کرتا ہوں کہ کفایت شعاری کی ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جو برار کی مالی پوزیشن کو ایسی

بنیاد پر قائم کرنے کے لئے قابل عمل پائی جائیں جس سے نظام کو ادا کرنے کے لئے مخارج پر مداخل کی کافی زیادتی نکل آئے"۔

اس کے جواب میں حیدرآباد کے ریزیڈنٹ نے ایک طویل رپورٹ بھیجی جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

دونوں حکومتوں کے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان شرائط پر از سر نو غور کیا جائے جنکے ماتحت برار کا موجودہ انتظام ہو رہا ہے تاکہ ہز ہائی نس نظام کو انکے ان اضلاع سے جو ہماری تفویض میں ہیں۔ اس سے زیادہ باقاعدہ اور معین آمدنی دی جائے جتنی موجودہ معاہدہ کے ماتحت دی جانی ممکن ہے۔ اس معاملہ میں معاہدہ کی شرائط کی پوری پابندی کی گئی ہے، مگر معاہدہ خود ہی ایسا ہے کہ نظم و نسق میں کسی کفایت شعاری کا موقع نہیں دیتا اور زیادہ بچت نکالنے سے روکتا ہے۔ اب تک بڑی سے بڑی رقم جو کسی ایک سال میں ہز ہائی نس کو دی گئی ہے وہ ۱۸۸۱ء میں ۹۷۴۰۰۰ کی رقم تھی چند سال ایسے بھی گذرے ہیں جنمیں کوئی بچت ہی نہیں نکلی۔ اور ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء تک قریب قریب ۹ لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم سرکار نظام کو دی گئی ہے۔ زیادہ قریبی زمانہ میں تو ایسے حالات پیش آگئے ہیں کہ آئندہ چند سال کے لئے بچت نکالنے کا موقع ہی نہیں رہا۔ بہرحال صاف ظاہر ہے کہ چالیس سال سے برار ریاست حیدرآباد کیلئے محض ایک غیر معین اور گھٹتی بڑھتی آمدنی کا ذریعہ رہا ہے، اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس صورت حال میں کسی قسم کا تغیر ہونے کی کوئی امید نہیں ہے"۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر نظام ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کو بدلکر حکومت ہند کی مرضی کے مطابق دوسرا انتظام کرنے پر راضی نہ ہونگے تو جس طرح چالیس سال سے ان کو غیر معین اور گھٹتی بڑھتی آمدنی ملتی رہی ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی بس ایسی ہی ملتی رہیگی، بلکہ آئندہ اتنی بھی ملنے کی امید نہیں ہے! ایک طرف قحط کے باعث سرکار نظام کی مالی حالت حد درجہ خراب ہو رہی تھی، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی نے اسکو سخت پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا اور اسے ۲ کروڑ کے قریب قرض لینا پڑا تھا۔ دوسری طرف وہ پرانا دوست جسکی مدد کیلئے نواب میر محبوب علی خاں مرحوم نے ۶۰ لاکھ روپیہ کی رقم اپنی رعایا کی اور بوقت ضرورت خود اپنی جسمانی خدمات کے ساتھ پیش کی تھی، اسنے یہ کہا تھا کہ میں تمہارے ملک کے سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے تم کو اس شدید ضرورت کے موقع پر اسوقت تک ایک پیسہ نہ دونگا جب تک تم میری ان شرائط کو نہ مان لوگے جنہیں تمہارے والد نے چالیس سال پہلے نامنظور کیا تہا۔ اس سے زیادہ احسان شناسی، شرافت اور آدمیت اور کیا ہو سکتی تھی؟ پہلے بھی اخلاقی فضیلت دوست پر فوجی حملہ کی دہمکی کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ اب زمانہ بدل چکا تھا، اسلئے وہی چیز اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ دوست کو شدید مالی مشکلات میں مبتلا کرکے اپنی شرائط ماننے پر مجبور کیا گیا۔

یہ نازک حالت تھی جس میں برار کی آمدنی کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے سرکار نظام نے ۱۹۰۱ء میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا جو چند مہینہ تک

چلتا رہا۔ آخر ۱۹۰۲ء کے اوائل میں لارڈ کرزن نے خود حیدرآباد جاکر اس کو طے کرنے کا قصد کیا اور ۳۰ مارچ کو اعلیٰ حضرت مرحوم سے وہ تاریخی ملاقات کی جس کا نتیجہ ایک سمجھوتہ کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس سفر کا مقصد خود لارڈ کرزن ہی نے اپنے ۱۲ نومبر ۱۹۰۲ء کے ایک مراسلہ میں اس طرح بیان کیا ہے:-

امتداد زمانہ سے یہ (۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے) طے گئے ہوئے معاملات غیر مناسب بھی ہوگئے تھے اور فرسودہ بھی، اور اسکے ساتھ ہی کبھی کبھی نزاعات بھی پیدا کرتے رہتے تھے۔ . . . گورنمنٹ آف انڈیا کی جانب موجودہ الوقت انتظام کی خرابی یہ تھی کہ معاہدات کے ماتحت صوبہ کا فوجی و دیوانی نظم و نسق ناقص اور مسرفانہ تھا۔ اور ہز ہائی نس کی جانب تغیر کی خواہش فاضل باقیات کی اس غیر معین اور ناپائدار حالت سے پیدا ہوئی تھی جسکی بے ضابطگی و پراگندگی ریاست کے مالیات میں بے ثباتی کا افسوسناک عنصر پیدا کر رہی تھی۔"

آگے چلکر لارڈ کرزن کہتا ہے کہ اس عقدہ کا حل اس نے یہ سوچا تھا کہ ان انتظامی دشواریوں کو ایسے طریقے سے دور کیا جائے جس سے "ہز ہائی نس نظام کو انکی مملکت کے اس خطہ سے ایک معین آمدنی حاصل ہو سکے اور برار کی ۲۸ لاکھ آبادی کے لئے ان حالات اور مراتب کے استمرار کا اطمینان کر لیا جائے جنسے وہ خوشحالی کے بلند درجہ پر پہنچ گئے ہیں"۔ ان حالات اور مراتب کا استمرار دوسرے الفاظ میں برٹش

گورنمنٹ کے قبضہ و تصرف کا استمرار تھا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر لارڈ کرزن نے گفت و شنید کا آغاز کیا اور اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ برٹش گورنمنٹ کو برار کا دوامی پٹہ اس شرط پر دیدیا جائے کہ وہ جسطرح چاہے اس کا انتظام کرے اور اسکے عوض ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل خراج سرکار نظام کو دے۔ اول اول اعلیٰ حضرت مرحوم نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کیا اور برار کی واپسی پر زور دیا، مگر جب لارڈ کرزن نے انہیں یقین دلا دیا کہ برار ہرگز واپس نہ کیا جائیگا، اور ۱۸۶۰ء کی شرائط پر قائم رہنے سے وہ برار کی آمدنی کا بھی فائدہ نہ اٹھا سکینگے تو مجبوراً انہوں نے لارڈ کرزن کی اس تجویز کو قبول کر لیا اور ۵ رنومبر ۱۹۰۲ء کو فریقین کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا جس کی دفعات حسب ذیل تھیں:-

دفعہ اول۔ ہز ہائی نس نظام جنکے شاہی حقوق اضلاع مفوضہ پر از سر نو تسلیم کئے جاتے ہیں، ان اضلاع کو دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کے حوالہ کرتے ہیں، جس کے عوض برٹش گورنمنٹ انکو ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا معین اور مستقل خراج ادا کریگی۔

دفعہ دوم۔ حکومت برطانیہ اضلاع مفوضہ میں اس مکمل اور غیر مشترک فیہ اختیار و اقتدار کو برقرار رکھتے ہوئے جو اسے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے حاصل ہیں، اس امر میں آزاد ہو گی کہ بلا لحاظ ان معاہدات کی خلاف ورزی کے، اضلاع مفوضہ کا ایسے طریقہ سے انتظام کرے جسے وہ پسند کرتی ہو، نیز یہ

کہ ان افواج کو جو حیدرآباد کنٹنجنٹ کے نام سے قائم ہیں جسطرح مناسب سمجھے از نو تقسیم کرے تخفیف کرے تنظیم کرے اور نگرانی کرے، البتہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ۴ میں ہز ہائی نس کے مقبوضات کی حفاظت کا جو اقرار اس نے کیا ہو اسے جیسا کہ واجب ہے پورا کرنے کا بندوبست کرو ے" ۵۱

اس مختصر سے معاہدے کے ذریعہ لارڈ کرزن نے صرف یہی فائدہ نہیں اٹھایا کہ برار کا دوامی پٹہ حاصل کرلیا جو پچاس سال پہلے باوجود دھمکیوں اور بھپکیوں Objurgations & threats کے حاصل نہ ہوسکا تھا، بلکہ برار کو ناگپور کی کمشنری سے ملحق کرکے ایک صوبۂ متوسط بنانے کی تمنا بھی پوری کرلی جسے ۱۸ میں نواب افضل الدولہ نے رد کردیا تھا اور حیدرآباد کنٹنجنٹ کو توڑ دینے کا بھی اختیار حاصل کرلیا حالانکہ اسی فوج کی خاطر صوبۂ برار سرکار نظام سے حاصل کیا گیا تھا اور اس فوج کو توڑ دینے کے بعد اس صوبہ پر انگریزی قبضہ رہنے کی کوئی معقول کیا معنی نامعقول وجہ بھی نہ تھی۔ ایسے عظیم فوائد کے مقابلہ میں انگریزی حکومت نے صرف ۲۵ لاکھ سالانہ کی رقم پیش کی اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اسمیں سے بیس سال تک ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ برار کے قرضوں (Berar loans) میں اور ایک غیر متعین مدت تک ساڑھے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ حیدرآباد کے قرضہ (Hydarabad loan) میں وضع کیا جاتا رہیگا اور سرکار نظام کو انکے سب سے زیادہ زرخیز صوبہ سے صرف ساڑھے چھ لاکھ روپیہ سالانہ ملیگا۔ بعد میں سرکار نظام کی درخواست پر اس شرط

۵۱ Aitchison's Treaties. Vol IX. P.175.

میں تھوڑی سی ترمیم ہوگئی جس کے مطابق ایسا انتظام ہوگیا کہ ۲۵ لاکھ کی پوری رقم تیں سال بعد سرکار نظام کو ملنی شروع ہوجائیگی۔ چنانچہ ابھی اس وقت کے آنے میں چند سال باقی ہیں۔

یہ معاہدہ تو بیشک ہوا اور سرکار نظام نے اسکی تصدیق بھی کی لیکن سوال یہ ہے کہ قانونی حیثیت سے یہ کہاں تک ایک جائز معاہدہ تھا؟ اسکے لئے حسب ذیل امور قابل غور ہیں:-

(۱) اعلیٰحضرت میر محبوب علی خاں مرحوم برار کا دوامی پٹہ لکھنے کیلئے ہرگز طیار نہ تھے۔ جسوقت یہ تجویز انکے سامنے پیش کی گئی تو انہوں نے اور امراء و اعیان سلطنت کی کونسل نے بالاتفاق اس کی مخالفت کی اور ۳۰ مارچ ۱۹۰۲ء کو سب کے مشورہ سے اعلیٰ حضرت مرحوم کی جانب سے ایک خط لارڈ کرزن کے نام لکھا گیا جسے خود مرحوم اپنے ہاتھ سے پیش کرنے والے تھے۔ اس خط میں لکھا تھا کہ:-

"میں اس پرانے جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ استرداد برار کے لئے میرے حقوق کیا ہیں یا اسکے متعلق معاہدات اور دوسرے سرکاری عہود و مواثیق کے معنی کیا ہیں۔ میں پورے بھروسے کے ساتھ ان معاملات کو یور اکسلنسی کی توجہات کریمانہ و مشفقانہ پر چھوڑتا ہوں۔ میں آپکے توسط سے ہز مجسٹی شہنشاہ معظم کی خدمت میں صرف یہ گذارش کرونگا کہ وہ لطف و کرم کی ایک خاص علامت کے طور پر برار واپس کردیں، اور میں یہ اجازت چاہونگا کہ یور لارڈشپ کو اس معاملہ میں اپنا وکیل بناؤں۔ میں پورا یقین رکھتا ہوں، اور مجھے

کامل بھروسہ ہے کہ میری یہ گذارش ہز میجسٹی کی تاج پوشی کے مبارک موقع پر رائیگاں نہ جائیگی"

(۲) اعلیٰ حضرت مرحوم اپنے اس مطالبہ سے معسکر دوامی پٹہ کی تجویز کو قبول کرنے پر صرف اسوقت راضی ہوئے جب لارڈ کرزن نے انکو پورے زور کے ساتھہ یہ یقین دلادیا کہ پچھلے معاہدات کی روسے انکو برار کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے - اور اگر وہ ایسا کرینگے بھی تو اسے ہرگز نہ قبول کیا جائیگا - معاہدہ کی گفت وشنید کے متعلق لارڈ کرزن نے جو نوٹ لکھا تھا اسمیں وہ خود کہتا ہے :-

"میں نے جب سنا کہ ایسی صریح فائدہ مند شرائط ہز ہائی نس کو پسند نہیں آئیں تو مجھے سخت مایوسی ہوئی - اگر ان شرائط کو رد کردیا گیا تو حکومت ہند پھر موجودہ پوزیشن کی طرف رجوع کریگی جسکے لئے کوئی مدت متعین نہیں ہے - اور جسمیں ہم پچاس سال سے نسبتہً بہت کم مالی معاوضہ دیکر اس شئے سے استفادہ کررہے ہیں جو در اصل مقصود بالذات ہے - اسکے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہے جسکی بنا پر مجھے موجودہ تجاویز کے ناکام ہونے پر افسوس کرنا چاہیے اگر انکو رد کردیا گیا تو یہ حد درجہ غیر متوقع ہے کہ میرے بعد آنے والا کوئی وائسرائے اس سوال کو دوبارہ چھیڑیگا یا برطانیہ کی کوئی حکومت اپنی بات کو دوبارہ رد کرانا پسند کریگی - اسلئے ہز ہائی نس کو اچھی طرح سمجھہ لینا چاہئیے کہ تصفیہ کا جو موقع اب ان کو دیا جارہا ہے اسکے دوبارہ پیش کئے جانے کی توقع نہیں ہوسکتی - اور یہ کہ ایسی صورت میں معاملات کی موجودہ غیر

ہی ایک دائمی صورت اختیار کریگی۔

"مگر انہوں نے (یعنی نظام نے) یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ آیا جدید تصفیہ میں انہیں آزادی باقی رہیگی کہ آئندہ کسی وقت وہ برار کی واپسی کا مطالبہ کریں؟ اسکا جواب میں نے یہ دیا کہ اگر برار دوامی پٹہ پر برٹش گورنمنٹ کو دیدیا گیا تو ہزہائی نس کے لئے ایسی کوئی درخواست کرنے کا موقع نہ رہیگا کیونکہ اسوقت صوبہ کی قسمت کا فیصلہ پہلے ہی پٹہ کے ذریعہ ہو چکا ہوگا۔ پھر ہزہائی نس نے پوچھا کہ آیا موجودہ حالات میں اسکا کوئی امکان ہے کہ برار انکو واپس دیدیا جائے؟ میں نے جواب دیا کہ معاہدات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے استرداد برار کا تصور کیا جا سکے یا جس سے حیدرآباد کو استرداد کا کوئی حق پہنچتا ہو۔ ...... برٹش گورنمنٹ کے لئے مجوزہ شرائط کا بدل اسکے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اس دوامی تفویض پر قائم رہے جو پہلے ہی سے از روئے معاہدات اسکو حاصل ہے۔ تب ہزہائی نس نے کہا کہ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے برار واپس ملنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے، لہذا مجھے مجوزہ دوامی پٹہ لکھہ دینے میں کوئی تامل نہیں ہے کیونکہ وہ ریاست کے مفاد کیلئے زیادہ اچھا ہے اب تک میں اسکو صرف اسلئے نامنظور کر رہا تھا کہ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ آئندہ مجھے برار واپس ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے"

خود اعلیٰ حضرت مرحوم نے بھی اس ملاقات کی کیفیت لکھتے ہوئے اپنے نوٹ میں صاف لکھا ہے کہ:۔

"وائسرائے نے مجھہ سے دو بارہ سہ بارہ کہا کہ برار کبھی واپس نہیں دیا جا سکتا ہز اکسلنسی نے کہا کہ میں یور ہائی نس کو کسی غلط امید میں نہیں رکھنا چاہتا"

میں بالکل صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ محض میری ہی نہیں بلکہ تمام وائسرایوں کی جو میرے بعد آئیں گے یہی پالیسی ہوگی، اور انگلستان میں بھی حکومت کی یہی پالیسی ہوگی کہ برار کبھی کسی زمانہ میں واپس نہ کیا جائے "۔ وائسرائے کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ گذشتہ ۵۲ سال کے درمیان برار کی واپسی کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی گئی اس لئے اب یہ ہمارے لئے ناممکن ہو کہ اسے واپس حاصل کریں اور اب ہمیں اس کی واپسی کی کوئی امید نہ کرنی چاہیے، ہزاکسلنسی نے بیان کیا کہ "اگر موجودہ صورت حال برقرار رکھی گئی تو اس سے آپ کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا، جب برار کو واپس کرنا ناممکن ہو تو موجودہ حالت کو برقرار رکھنا خلاف عقل ہے، اس سے بہتر ہے کہ اس کو پٹہ پر دیدیا جائے اور اس کے عوض سال بہ سال روپیہ لے لیا جائے"۔ تاہم میں نے کوشش کی جہانتک میں کرسکتا تھا کہ واپسی پر اصرار کروں، مگر وائسرائے کے جوابوں کا انداز دیکھکر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ہمکو برار واپس نہیں دیں گے۔ یہ پچھلی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کو اس صوبہ سے ہاتھ دھونا پڑا، اس وقت میں یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ اگر یہ صورت ہے تو اسے پٹہ پر لے لیجئے"۔

فریقین کے ان بیانات کو پڑھ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے نے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان سے برٹش گورنمنٹ کو برار کی "دوامی تفویض" (Perpetual assignment) پہلے سے حاصل ہے، اور نظام کا حق استرداد ان معاہدات کی رو سے کلیۃً زائل ہوچکا ہے اگر وائسرائے سابقہ معاہدات کی یہ تعبیر کرکے اعلیٰ حضرت مرحوم کو یہ قطعی یقین نہ دلادیتا کہ

برار کے واپس دئے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق اعلیٰ حضرت مرحوم دوامی پٹہ کو ہرگز قبول نہ کرتے۔

(۳) سابقہ معاہدات اور حکومت برطانیہ کی سرکاری تصریحات کو دیکھتے ہوئے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ وائسرائے کی یہ تعبیر بالکل غلط اور سراسر خلاف واقعہ تھی تفویض برار کے پہلے معاہدہ کے وقت حکومت ہند کے وکیل مختار کرنل لو نے نواب ناصر الدولہ مرحوم کو یہ یقین دلایا تھا کہ۔

"اگر ہز ہائی نس چاہتے ہیں تو یہ اضلاع کنٹنجنٹ کی پرورش کی غرض سے محض اسوقت تک کے لئے تفویض کئے جا سکتے ہیں جبتک انہیں اس کی ضرورت ہے .... جب (ہز ہائی نس کے خواہش کرنے پر) یہ ساری فوج توڑ دی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت صرف ہوگی تو نظام ان اضلاع کو اپنے انتظام میں واپس لے سکتے ہیں۔"[۱]

اس کے بعد ۵ ستمبر ۱۸۶۰ء کو حکومت ہند کی جانب سے یہ یقین دلایا گیا کہ:

"مفوضہ اضلاع کے ایک حصہ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے سے حکومت ہند کا مقصد صرف یہ ہے کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی دفعہ ششم کی شرائط کو پورا رکھنے کیلئے وہ ایک مادی ضمانت اپنے پاس رکھے، گورنمنٹ آف انڈیا نے جسطرح ابتک تمام اضلاع مفوضہ کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اسی طرح اب بھی وہ اس علاقہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ ہز ہائی نس کی طرف سے اپنی "امانت" میں ([illegible]) صرف اسوقت تک کے لئے رکھنا چاہتی ہے جب تک کنٹنجنٹ رکھی جائے

---

[۱] دیکھو کرنل لو کا مراسلہ مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۵۳ء نمبر ۱۱ صیغہ خارجہ

اس سے زیادہ عرصہ کے لئے وہ نہیں رکھنا چاہتی .... اور یہ واقعہ ہے کہ ہزہائی نس کے مقبوضات کے اس حصہ کا انتقال محض عارضی (temporary measure) ہے .... جب کبھی اضلاع زیر بحث نظام کو واپس کئے جائیں گے تو ہزہائی نس ان تمام فوائد سے متمتع ہوسکیں گے جو برطانی افسروں کے زیر انتظام رہنے کے زمانہ کی ترقیات سے ممکن ہے کہ آئندہ پیدا ہوں۔[۵۱]

اس کے بعد ۲۶ دسمبر ۱۸۶۰ء کو دونوں سلطنتوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی دفعہ ۶ میں بصراحت یہ لکھا گیا تھا کہ۔

"اضلاع واقع برار جو پہلے ہی معاہدہ ۱۸۵۳ء کے ماتحت برٹش گورنمنٹ کو تفویض کئے جاچکے ہیں، مع ان تعلقہ جات صرف خاص کے جو اُن میں واقع ہیں اور مع ان مزید اضلاع متصلہ کے جو بحالت موجودہ ۳۲ لاکھ روپیہ سکہ حکومت برطانیہ کی سالانہ آمدنی دینے کے لئے کافی ہوں، برٹش گورنمنٹ کے پاس امانت میں (in trust) رہیں گے، تاکہ ان سے حیدرآباد کنٹنجنٹ کی تنخواہیں اور آپا دیسائی کی چوتھ، ہیبت رام کے خاندان کا سالیانہ اور چند دوسری پنشنیں جنکا ذکر عہدنامہ مذکور کی دفعہ ششم میں کیا گیا ہے، ادا کی جائیں۔"[۵۲]

اس کے بعد ۵ جنوری ۱۸۶۱ء کو لارڈ کیننگ (وائسرائے) نے سر چارلسووڈ (وزیر ہند) کو جو مراسلہ بھیجا تھا اس میں وہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے۔

---

۵۱ دیکھو مسٹر بنگ ڈپٹی سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کا مراسلہ نمبر ۹۸۸ صیغہ خارجیہ

۵۲ Aitchison vol IX P. 106

"نظام کو بتایا گیا کہ حکومت ہند اضلاع مفوضہ کو اپنی ملکیت میں نہیں بلکہ اپنی "امانت" میں رکھنا چاہتی ہے، اور صرف اسوقت تک رکھنا چاہتی ہے جب تک کہ کنٹنجنٹ رکھی جائے نہ کہ اس سے زیادہ ...... ان سے کہا گیا کہ اضلاع برار اب بھی ہز ہائی نس کے مقبوضات کا ایک غیر منفک جز ہیں اور وہ ان کو اسوقت بتامہا واپس کر دیئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہوگا کہ اُن قرار دادوں کو بدل دیں جن کے ماتحت کنٹنجنٹ رکھی گئی ہے۔"[۱]

اس کے بعد سر سالار جنگ کے پیہم مطالبات کے جواب میں ۲۸ مارچ ۱۸۷۸ء کو جو "آخری اور قطعی" فیصلہ لارڈ سالسبری نے وزیر ہند ہونے کی حیثیت سے صادر کیا تھا، اسمیں بھی یہ تصریح موجود تھی کہ:-

"یہ بالکل ظاہر ہے کہ معاہدہ میں برار کو قطعی طور پر حوالہ نہیں کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی ایسا ہی انتظام چاہتے تھے، مگر اسپر نظام کو ایسے اعتراضات تھے جنکو ان کے ذہن سے دور نہیں کیا جا سکتا تھا، اور اسے قبول کرنے پر انہیں مجبور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر تفویض قطعی ہوتی تو ملکیت بتامہا تاج برطانیہ کی طرف منتقل ہو جاتی، مگر کوئی انتقال ملکیت وقوع پذیر نہیں ہوا، بلکہ یہ علاقہ نظام کے مقبوضات میں اسی طرح شامل رہا جسطرح معاہدہ پر دستخط ہونے سے پہلے تھا...... اگر ہز ہائی نس (جو اسوقت تک سن بلوغ کو نہ پہونچے تھے) امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کریں گے کہ ان تمام معاملات پر جو دولتین کے درمیان از روئے معاہدہ طے ہوئے ہیں ایک

---

[۱] دیکھو لارڈ کیننگ کا مراسلہ نمبر ۱۴ صیغہ خارجیہ

عام نظر ثانی کی جائے تو برٹش گورنمنٹ ہز ہائی نس کی اس درخواست پر غور کرے گی"۔

یہ تمام سرکاری تحریرات اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ برار کی تفویض "دوامی" (Perpetual) نہیں تھی جیسا کہ لارڈ کرزن نے اس کو ۱۹۰۲ء میں ظاہر کیا، بلکہ "عارضی" (Temporary) تھی جیسا کہ ۱۸۵۳ء سے ۱۸۷۸ء تک ریزیڈنٹ سے لیکر وزیر ہند تک، تمام ذمہ دار افسران متعلق اظہار و اعلان کرتے رہے تھے، یہ دستاویزات لارڈ کرزن کی اس تعبیر کو بھی بالکل غلط ثابت کرتی ہیں کہ "معاہدات میں حضور نظام کے لئے استرداد برار کا کوئی حق محفوظ نہیں رکھا گیا ہے"، برعکس اس کے خود وہ وائسرائے جس نے ۱۸۶۰ء کا معاہدہ طے کیا تھا اپنے معاہدہ کی یہ تعبیر کرتا ہے کہ برار کی تفویض ایک امانت (Trust) کے طور پر تھی، اور کنٹنجنٹ کی برطرفی کے بعد اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی باقی نہیں رہنا تھا لارڈ کرزن نے معاہدات کی یہ تعبیر کی کہ ان کے ماتحت صرف دو ہی صورتوں پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ ایک یہ کہ برار کا دوامی پٹہ لکھدیا جاتا، دوسرے یہ کہ تفویض کی موجودالوقت صورت کو دواماً جاری رکھا جاتا۔ اس کے سوا تیسری صورت کو اس نے ناممکن قرار دیا، حالانکہ کرنل لو اور لارڈ کیننگ جو ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدوں کے اصلی بانی تھے، انہوں نے صراحت کے ساتھ تیسری صورت یعنی برار کی واپسی کا نہ صرف امکان ظاہر کیا تھا بلکہ ان کے نزدیک عارضی تفویض کو برار کی واپسی ہی پر ختم ہونا چاہیئے تھا، اس معاملہ میں لارڈ کرزن نے ۱۸۶۰ء کے معاہدہ کی بھی کھلی ہوئی معنوی تحریف کی جس کے اندر بالفاظ صریح یہ لکھا تھا کہ برار کی

تفویض "امانت" ([illegible]) کے طور پر ہے، اور لارڈ سالسبری کے صریح وعدہ کو بھی پس پشت ڈالدیا، جس میں سرکار نظام کو یقین دلایا گیا تھا کہ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان جب سن بلوغ کو پہونچکر بذات خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لیں گے تو انہیں برار کی واپسی کے مسئلہ کو ازسر نو چھیڑنے کا حق ہوگا۔

ان تمام سرکاری شہادتوں کے خلاف لارڈ کرزن نے معاہدات کی غلط تعبیر کرکے اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان مرحوم کو صریح دھوکا دیا، اور ایک غلط اور ناجائز اثر ڈالکر انہیں دوامی پٹہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا۔

(۴) تفویض برار کی اصلی علت یہ تھی کہ کنٹنجنٹ کی پرورش کے لئے برٹش گورنمنٹ کو بقول لارڈ کیننگ کے ایک "مادی ضمانت (material guarantee) اور بقول سالسبری کے ایک "ارضی ضمانت (territorial guarantee) کی ضرورت تھی، اول اول جب اس کا مطالبہ کیا گیا تھا تو یہی کہا گیا تھا کہ چونکہ کنٹنجنٹ کی تنخواہیں ٹھیک وقت پر باقاعدگی کے ساتھ نہیں ملتیں اسلئے ہمارے ہاتھ میں ایک مستقل ذریعہ آمدنی (Permanent source of income) ایسا رہنا چاہئے جس سے ہم اس ذمہ داری کو ادا کرسکیں۔

چنانچہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کی دفعات نمبر ۶ میں اس تفویض کی اصلی غرض یہی کو بیان کیا گیا تھا، اور دونوں معاہدات کی ترتیب کے وقت یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جب کنٹنجنٹ کی ضرورت باقی نہ رہے گی تو تفویض منسوخ ہوکر ملک اس کے اصلی مالک کو واپس کردیا جائے گا۔ کرنل لو نے ۱۸۵۳ء میں کہا تھا کہ:-

"جب یہ ساری فوج توڑدی جائے گی جس میں چند ہی سال کی مدت عرف

ہو گی تو نظام ان اضلاع کو واپس لے سکتے ہیں۔

۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ نے کہا تھا کہ:۔

"وہ (یعنی اضلاع برار) نظام کو اس وقت تما مہا واپس کر دئے جائیں گے جب دونوں حکومتوں کو یہ مناسب معلوم ہوگا کہ ان قراردادوں کو بدل دیں جن کے ماتحت کنٹنجنٹ رکھی گئی ہے"

ان سرکاری تصریحات کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جب کنٹنجنٹ کے برطرف کر دینے پر دونوں حکومتوں کے درمیان اتفاق ہو جاتا تو وہ ملک جو کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے لیا گیا تھا واپس کر دیا جاتا لیکن لارڈ کرزن نے معاہدات کے اسپرٹ اور الفاظ دونوں کے خلاف یہ کیا کہ جب دونوں سلطنتوں کے درمیان کنٹنجنٹ کے برطرف کرنے پر اتفاق ہو گیا تو کنٹنجنٹ کو تو توڑ دیا، مگر ملک کو جو کنٹنجنٹ کی خاطر "ضمانت" میں لیا گیا تھا واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ لارڈ کرزن خود اپنے نوٹ میں لکھتا ہے کہ:۔

"حیدرآباد کنٹنجنٹ جیسی کہ وہ اسوقت معاہدات کے ماتحت قائم ہے ایک فضول خرچ اور ناقابل اطمینان شے ہے، حیدرآباد کے علاقہ میں جو فوجیں مقیم ہیں وہ جدید ضروریات سے بالکل زائد ہیں، اور ان کا اس نام سے باقی رہنا ہز ہائی نس کے لئے نفرت انگیز بھی ہے اور بے موقع بھی"

۹۰ برس کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ کنٹنجنٹ کو "فضول خرچ"، "ناقابل اطمینان"، "زائد از ضرورت"، "نفرت انگیز" اور "بے موقع" تسلیم کیا گیا، اور اس کے توڑ دینے پر سرکار نظام اور سرکار انگریزی کے درمیان اتفاق رائے ہو گیا۔ اس اتفاق رائے

سے اضلاع برار کو تمام وہا واپس کر دینے کے لئے وہ شرط پوری ہو چکی تھی جو ۱۸۶۰ء میں لارڈ کیننگ نے مقرر کی تھی، مگر لارڈ کرزن نے عقل، منطق، معاہدات اور مواعید سب کے خلاف علت کو فوت کرنے کے بعد بھی معلول کو برقرار رکھا، اور کنٹنجنٹ کو توڑ دینے کے باوجود ملک کو اپنے قبضہ میں رکھنے پر اصرار کیا، حالانکہ اب سرکار نظام کی طرف سے انگریزی حکومت پر کوئی ایسی ذمہ داری باقی نہ تھی جسکو ادا کرنے کے لئے کل ممالک محروسہ کا تیسرا حصہ اس کو دینے کی ضرورت باقی رہتی۔

یہ امور ایسے ہیں کہ جنکی بنا پر ۱۹۰۲ء کا یہ معاہدہ قطعاً ناجائز قرار پاتا ہے، اور اس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں رہتی کہ سلطنت برطانیہ کے وائسرائے نے اپنے وفادار دوست کو دھوکہ دیکر اور غلط باتیں باور کرا کے لاعلمی کی حالت میں ایسی دستاویز پر دستخط حاصل کر لئے، جسپر خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق، وہ ہرگز دستخط نہ کرتا اگر اس کو معاہدات کے اصلی معانی سے باخبر ہونے دیا جاتا، لارڈ کرزن نے قصداً اعلیٰ حضرت مرحوم سے تنہائی میں یہ معاملہ طے کیا مدار المہام یا کسی اور واقف کار و معاملہ فہم مشیر تک کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہ دی اور ان کو ناواقفیت میں بزور و بہ اصرار غلط باتوں کا یقین دلا کر ان کے آبائی ملک کا سب سے زیادہ زرخیز حصہ ہمیشہ کے لئے ان سے حاصل کر لیا۔

یہ سلوک تھا سلطنت برطانیہ کا اپنے اس دوست کے ساتھ جس نے چند سال پہلے جوش وفاداری میں ۲۰ لاکھ روپیہ اس کی اعانت کے لئے پیش کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وفاداری کی قدر شناسی کا یہی وہ طریقہ ہو جسپر برطانی قوم فخر کرتی ہے۔

اعلیحضرت میر عثمان علیخان بہادر کا دور

سلا۱۹۱۱ء میں اعلیحضرت میر محبوب علیخان مرحوم کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ فرمانروائے حال اعلیحضرت میر عثمان علی خان بہادر مسند آرائے سلطنت ہوئے، آپ کے زمام امور ہاتھ میں لینے کے تین ہی سال بعد وہ جنگ عظیم برپا ہوئی کہ جسمیں انگریزی حکومت کے لئے زندگی و موت کا سوال درپیش ہو گیا، اس نازک وقت میں مسلمانوں کے لئے سلطنت برطانیہ کا وفادار رہنا سب سے زیادہ مشکل تھا، کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت جس کے بادشاہ کو تمام مسلمان اپنا امام سمجھتے تھے برطانیہ کے خلاف برسر پیکار تھی، اور وہ ممالک احاطۂ جنگ کی زد میں تھے جن کی تعظیم و تکریم ہر مسلمان کا جزو ایمان تھی لیکن اس موقع پر اعلیحضرت میر محبوب علیخان بہادر نے سلطنت برطانیہ کے ساتھ وہ وفاداری برتی جو اس سلطنت کے تمام دوستوں کی وفاداری سے زیادہ قیمتی اور خود اعلیحضرت کے پیشرووں کی وفاداریوں پر بھی فائق تھی۔

ایک طرف حضور ممدوح نے اپنے اس اخلاقی و روحانی اثر کو استعمال کیا جو انہیں تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر حاصل تھا، اور مسلمانوں کو پورے زور کے ساتھ تلقین کی کہ وہ سلطنت برطانیہ کے مواعید پر بھروسہ کر کے اسکی وفاداری پر ثابت قدم رہیں، یہ اخلاقی امداد اس قدر موثر ثابت ہوئی کہ خود انگریزی سلطنت کے ارباب حل و عقد کو اعتراف ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جن اثرات کے ماتحت جنگ میں سلطنت کی امداد کی، ان میں سب سے زیادہ حصہ اعلیٰ حضرت نظام

دکن کا تھا۔

دوسری طرف اعلیٰ حضرت نے اپنی سلطنت کے تمام ذرائع دولت برطا
کے لئے وقف کر دیئے، اس سلسلہ میں انہوں نے جو خالص مالی امداد دی ا
کی کیفیت ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوتی ہے۔

قرضہ جنگ میں	۱۴۶۰۰۰۰۰
تکمیل جنگ کے لئے بطور امداد	۱۸۲۰۹۶۰۰
بیسویں دکن ہارس اور امپیریل سروس ٹروپس کے مصارف بحساب ۳ لاکھ روپیہ ماہانہ۔	۱۲۴۰۰۰۰۰
جنگ کو اختتام تک پہنچانے کے لئے خاص عطیہ	۱۵۰۰۰۰۰
تحت البحر کشتیوں کی مدافعت کے لئے۔	۱۵۰۰۰۰۰
شاہ و ملکہ کے ازدواج کی ۲۵ سالہ یادگار کے موقع پر۔	۳۷۵۰۰۰
پرنس آف ویلز رلیف فنڈ۔	۱۰۰۰۰۰
امپیریل رلیف فنڈ۔	۱۰۰۰۰
متفرق اعانتیں۔	۱۳۴۶۰۰

اسکے علاوہ دوران جنگ میں سرکار عالی کے تمام کارخانے سامان حر
طیاری کے لئے وقف رہے، اور چار سال کی مدت میں انہوں نے ۹ لاکھ
سامان سلطنت برطانیہ کے لئے مہیا کیا، اعلیٰ حضرت نے اپنی عزیز رعایا کو ہزا
تعداد میں بھرتی کرکے میدان جنگ میں جانیں قربان کرنے کے لئے بھیجا
جنگ کے اختتام تک دولت آصفیہ کی باضابطہ فوج جنگ کی عملی خدمات انجا

رہی اور اسکا خرچ سرکار نظام نے اپنے خزانہ سے دیا، حکومت ہند کی شدید مالی مشکلات کے زمانہ میں ۵۰ لاکھ روپے کی چاندی کی اینٹیں مستعار دیکر اس کی مالی ساکھ کو بحال کیا، اور اسی طرح کی بیش قیمت اور مخلصانہ اعانتوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا، یہانتک کہ وہ زمانہ آگیا جب ایسی ہی دوستانہ اعانتوں کی بدولت یہ سخت وقت سلطنت برطانیہ پر سے ٹل گیا جس میں اس کا برباد ہو جانا کچھ مستبعد نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ اعلیحضرت کو ان کے ان گراں قدر احسانات کا بدلہ کیا ملا؟ اس کا جواب یہ ہو کہ جہاں تک زبانی جمع خرچ کا تعلق ہے بہت دل کھولکر احسان شناسی و اعتراف جمیل کا ثبوت دیا گیا، اعلیحضرت کو "ہز اکزالٹڈ ہائی نس" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا، انہیں "یار وفادار سلطنت برطانیہ" (Faithful ally of the British government) کا لقب عطا کیا گیا، شہنشاہ معظم سے لیکر ولی عہد، وائسرائے اور ریزیڈنٹ تک سب نے متعدد مرتبہ ان کی بیش بہا خدمات پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے، لیکن جب عملی احسان شناسی کا وقت آیا تو سلطنت برطانیہ کا رویہ یک سرمو بھی اس کی روایات قدیمہ کے خلاف نہ نکلا

اعلیحضرت کا مطالبہ استرداد برار

جنگ عظیم کے کامیاب اختتام کے بعد ہی ہندوستان میں ستیاگرہ، خلافت، اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوگئیں، جنھوں نے کچھ عرصہ کے لئے عظیم الشان برٹش انڈین ایمپائر کی بنیادوں کو متزلزل کردیا، ان نازک اور پیچیدہ سیاسی حالات میں اعلیحضرت نے اپنے حقوق طلب کرکے سلطنت برطانیہ کی پریشانیوں

میں مزید اضافہ کرنا اپنی خاندانی شرافت کے خلاف سمجھا، اور صرف یہی نہیں کہ جو
طلبی سے محترز رہے بلکہ ان وطنی و اسلامی تحریکات میں بھی سلطنت برطانیہ کو
اخلاقی امداد دیتے رہے اور اپنی ریاست میں تحریک خلافت تک کو بند کرادیا جسکی
بدولت اعلیحضرت کے متعلق ان کی ملت میں شدید بدگمانیاں پھیل گئیں۔

آخر جب یہ ہنگامہ و اضطراب کا دور بھی ختم ہوا اور برٹش گورنمنٹ تمام اندرونی
و بیرونی مشکلات سے نجات پاکر نسبتاً پرسکون حالت میں ہو گئی، تو اعلیٰحضرت میر
عثمان علیخاں بہادر نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنے کھوئے ہوئے صوبہ کی واپسی کا
مطالبہ کریں، اس غرض کے لئے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حضور ممدوح نے لارڈ
ریڈنگ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہوں نے برار کے متعلق اپنے دعاوی وضاحت
کے ساتھ پیش فرمائے۔ اور اس کے ساتھ ایک میمورینڈم بھی منسلک کیا جو اعلیٰ
حضرت کے دعاوی کے متعلق تمام دستاویزی شہادتوں پر مشتمل تھا، یہ خط جنوری
۱۹۲۴ء کے اواخر میں عام طور پر شایع ہو چکا ہے۔ اس لئے اس کو نقل کرنے کی
یہاں ضرورت نہیں ہے، البتہ اختصار کے ساتھ اسکے اصولی نکات ذیل میں درج
کردئے جاتے ہیں:۔

۱۔ ۱۷۶۶ء میں پہلی مرتبہ برٹش گورنمنٹ نے دولت آصفیہ سے یہ عہد کیا تھا۔
کہ وہ بوقت ضرورت اس کی فوجی امداد کرے گی، اور دولت آصفیہ نے اس امداد
کے معاوضہ میں شمالی سرکار کا علاقہ برٹش گورنمنٹ کے سپرد کیا تھا۔

۲۔ ۱۸۰۰ء میں اسی فوجی امداد کے لئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھی
گئی، اور اسکے لئے ۲۴۱۷۱۰۰ روپیہ کا خرچ دولت آصفیہ کے ذمہ عائد کیا گیا۔

۳۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں اس امدادی فوج کے مصارف کے لئے دولت آصفیہ سے ایک دوسرا علاقہ لیا گیا جس کی آمدنی ۶۲ لاکھ روپیہ سالانہ تھی، اسوقت یہ عہد کیا گیا تھا کہ یہ امدادی فوج ان تمام قوتوں کے خلاف ہر وقت استعمال کی جاسکے گی جو دولت آصفیہ کے امن وسکون میں اندر سے یا باہر سے خلل انداز ہونگی نیز اس کو ایسی حالت میں بھی استعمال کیا جا سکے گا جبکہ سرکار نظام کی رعایا میں سے کوئی اس کی اطاعت سے انحراف کریگا، یا خراج ادا کرنے میں پہلوتہی کرے گا۔

۴۔ اس معاہدہ کے بعد جب سرکار نظام کو اپنی باغی رعایا کی سرکوبی کے لئے فوجی امداد کی ضرورت ہوئی تو اس فوج کی خدمات دینے سے انکار کیا گیا جو ۶۲ لاکھ کا ملک لیکر اسی غرض کے لئے قائم کی گئی تھی، اور ایک دوسری فوج انہی خدمات کو انجام دینے کے لئے قائم کی گئی جس کے لئے مزید ۴۰ لاکھ روپیہ سالانہ کا خرچ سرکار نظام کے ذمہ عائد کیا گیا۔

۵۔ اس جدید فوج کا قیام نہ کسی معاہدہ پر مبنی تہا نہ اس کے لئے سرکار نظام سے اجازت لی گئی، اور نہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ جائز تہا کہ ان خدمات کا معاوضہ دوبارہ وصول کرتی جن کا معاوضہ وہ پہلے وصول کرچکی تھی۔ مگر صرف یہی نہیں کہ یہ معاوضہ وصول کیا گیا بلکہ سرکار نظام سے فوج کا خرچ وصول کرنے کے باوجود اس کے تمام انتظامات کلیتہً انگریزی ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں رکھے گئے۔

۶۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں اس فوج کے بقایا کا ۴۳ لاکھ روپیہ (کلدار) سرکار نظام کے ذمہ قرض کے طور پر نکالا گیا، حالانکہ ۴۱ سال تک برٹش گورنمنٹ سکندرآباد اور جالنہ کی آبکاری کا محصول بلا کسی حق کے وصول کرتی رہی تھی، اور ۴۰ سال تک اس نے

امدادی فوج کو جس کا خرچ وہ پہلے وصول وصول کر چکی تھی، مقررہ تعداد سے زائد از ۲۰ فی صدی کم تعداد میں رکھا تھا، اگر دونوں سلطنتوں کے مطالبات کا باضابطہ محاسبہ کیا جاتا تو برٹش گورنمنٹ کے ذمہ خود سرکار نظام کا الٹا قرض نکل آتا لیکن برٹش گورنمنٹ نے باوجود پیہم مطالبہ کے حساب فہمی کرنے سے اعراض کیا اور اپنے ۴۰ لاکھ روپے کی کفالت اور آئندہ کے لئے اس ناجائز فوج کے مصارف کی ضمانت میں سرکار نظام سے اس کے ملک کا ایک اور حصہ طلب کیا۔

۷۔ نظام اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے راضی نہ تھے، مگر کمپنی نے فوجی حملہ کی دھمکی دیکر، اور یہ خوف دلاکر کہ ان کی جان اور ان کی سلطنت کی بھی خیر نہیں ہے، انہیں اس پر راضی کیا، اور اس طرح اضلاع برار، رو آبۂ رائچور، اور دھاراسیو کی تفویض عمل میں آئی۔

۸۔ سنہ ۱۸۵۳ء کا معاہدہ اس صریح مفاہمت کے ساتھ ہوا تھا کہ اضلاع مفوضہ صرف اسوقت تک برٹش گورنمنٹ کے تصرف میں رہیں گے جب تک سرکار نظام کو کنٹنجنٹ کی ضرورت رہے گی۔ اور یہ کہ جب سرکار نظام اس فوج کو توڑنے کی خواہش کرے گی تو اسے توڑ دیا جائے گا اور ملک اس کے اصلی مالک کو واپس دیدیا جائے گا سنہ ۱۸۶۰ء کے معاہدہ میں اس کی دوبارہ توثیق کی گئی۔

۹۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں جب سرکار نظام کی جانب سے کنٹنجنٹ کو توڑنے کی خواہش ظاہر کی گئی، اور اضلاع مفوضہ واپس مانگے گئے تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ فرمانروائے وقت کی نابالغی کے زمانہ میں ایسے مسائل پر بحث کرنا خالی از وقت نہیں ہے۔

۱۰۔ جب فرمانروائے وقت نے خود عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو وائسرائے

کی زبان سے ان کو پورے زور کے ساتھ یہ یقین دلایا گیا کہ برار کی تفویض عارضی نہیں بلکہ دائمی ہے، اس کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا اب سرکار نظام کو کوئی حق باقی نہیں رہا، اور اس امر کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ برار کبھی واپس نہ دیا جائیگا یہ غلط امور، تمام پچھلے عہود و مواثیق کے بالکل خلاف باور کرا کے ۱۹۰۲ء میں فرمانروائے وقت سے دوامی پٹہ حاصل کر لیا گیا، اگر ان کو یہ غلط باور نہ کرایا جاتا تو خود وائسرائے کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ کبھی اس پٹہ کو منظور نہ کرتے۔

۱۱۔ اگر بالفرض فرمانروائے وقت نے ۱۹۰۲ء کے تصفیہ کو برضا و رغبت قبول کیا تھا، تب بھی اسکا جواز مشتبہ ہے۔ کیونکہ ایسا تصفیہ کرنا ان کے آئینی اختیارات سے باہر تھا، اور ان حالات میں وہ اپنے ممالک کے کسی حصہ کو جو ان کے پاس ان کی رعیت اور ان کے جانشینوں کے لئے امانت کے طور پر تھا، منتقل کر دینے کا کوئی حق نہ رکھتے تھے"۔

۱۲۔ جبکہ برٹش گورنمنٹ نے معاہدات کرتے وقت سرکار نظام کے لئے برار کے استرداد کا حق صاف طور پر تسلیم کر لیا تھا، اور برار کی تفویض کنٹنجنٹ کے بقا پر موقوف رکھی گئی تھی، تو استحقاق بربنائے تصرف قدیم (Prescription) کا قانوناً کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ علاوہ ازیں جس معاملہ میں برطانیہ کی نیک نیتی کا سوال درپیش ہو، اس میں تصرف قدیم کے استحقاق کو پیش کرنا کسی طرح موزوں نہیں ہے جب ۱۸۸۱ء میں میسور کی ریاست بحال کی گئی تھی، تب بھی دیانت و انصاف کے مقابلہ میں تصرف قدیم کے استحقاق کو چھوڑ دیا گیا تھا۔

۱۳۔ پٹہ پر کسی ملک کے دیئے جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ پٹہ دار

کے املاک میں جذب ہو گیا۔ علی ہذا القیاس ملک برار کے پٹہ پر دیئے جانے سے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی و دیوانی نظام میں جذب ہو جائے، وہ اب بھی ریاست حیدرآباد کا ایک غیر منفک جزو ہے، مگر ۱۹۰۲ء سے اب تک جو سیاسی تغیرات ہوئے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف مالی حیثیت سے اہل برار کی دولت غیر براریوں کے تصرف میں آ رہی ہے، بلکہ جدید اصلاحات نے سیاسی حیثیت سے بھی ان کو باہر والوں کے تابع کر دیا ہے مثال کے طور پر صوبہ متوسط کی قانون ساز کونسل میں وہ اپنی کمی تعداد کی بنا پر ماتحت پوزیشن میں ہیں۔

ان وجوہ و دلائل کو پیش کر کے اعلیٰ حضرت نے اپنے صوبہ کی واپسی کا مطالبہ کیا اور اس خیال سے کہ کہیں برطانی راج کی برکات سے اہل برار کے محروم ہو جانے کا پرانا عذر پھر نہ پیش کیا جائے، حضور ممدوح نے یہ بھی تصریح کر دی کہ وہ اہل برار کو حکومت میں اس سے زیادہ اشتراک عمل کا موقع دیں گے جو اب تک برطانی راج میں ان کو حاصل رہا ہے، اور ایک گورنر کے ماتحت ان کو ذمہ دار حکومت خود اختیاری دیگر داخلی نظم و نسق کے اعتبار سے بالکل آزاد کر دیں گے۔

اعلیٰ حضرت کے اس مدلل اور مدبرانہ خط پر دہلی اور لندن میں ڈیڑھ سال تک غور و خوض ہوتا رہا، اور ۱۱ر مارچ ۱۹۲۶ء کو لارڈ ریڈنگ کی طرف سے اس کا جواب ایک طویل خط میں دیا گیا۔ اس خط کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اسمیں بنیادی مسائل سے اعراض کرنے کی وہی پرانی پالیسی اختیار کی گئی تھی جیسے لارڈ سالسبری نے سر سالار جنگ کے جواب میں اختیار کیا تھا، مسئلہ برار میں سب سے پہلا اور

اصولی سوال یہ ہے کہ آیا کنٹنجنٹ قائم کرنا اور اس کے مصارف کا بار سرکار نظام پر ڈالنا جائز تھا یا نہیں؟ اگر جائز نہ تھا تو وہ قرض جس کی بنا پر برار کی تفویض عمل میں لائی گئی، سرے سے بے بنیاد ہی ٹھہرتا ہے، اور ساری عمارت پیوند خاک ہوجاتی ہے جس پر برٹش گورنمنٹ کا قبضہ برار قائم ہے۔ اس اہم ترین بنیادی مسئلہ کو حل کرنے کے لیئے ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کے معنی اور حدود پر بحث کرنا ناگزیر ہے، لیکن لارڈ سالسبری کی طرح لارڈ ریڈنگ نے بھی اس نکتہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور اسے چھوڑ کر اس طرح گذر گئے کہ گویا یہ کوئی قابل اعتنا شے ہی نہیں ہے، اسی طرح دوسرا اہم بنیادی نکتہ یہ تھا کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے معاہدات کی رو سے برار کی تفویض قطعی تھی یا عارضی؟ مطلق تھی یا مقید؟ اگر عارضی اور مقید تھی تو یقیناً لارڈ کرزن نے اسکو قطعی اور مطلق قرار دیکر ان معاہدات کی غلط تعبیر کی اور اعلیحضرت میر محبوب علیخان مرحوم کو دہوکہ دیا، لارڈ ریڈنگ کے جواب میں پہلے نکتہ کی طرح یہ نکتہ بھی اچھوتا رہا اور ان دونوں ابتدائی مراحل کو چھوڑ کر انہوں نے دفعتہً تیسرے اور آخری مرحلہ پر اپنا سارا وزن رکھدیا، کیونکہ وہاں ان کو ذرا سی پاؤں رکھنے کی جگہ ملتی تھی، ان کے سارے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ لارڈ کرزن اور فرمانروائے حیدرآباد کے درمیان ۱۹۰۲ء میں جو معاہدہ ہوا تھا وہ برار کی قسمت کا آخری فیصلہ تھا، اسکے بعد اب اس صوبہ کی قسمت کا سوال دوبارہ نہیں چھیڑا جا سکتا۔ اس کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ لکھتے ہیں کہ:-

"نظام اچھی طرح اس مباحثہ کے لئے طیار تھے جو اُن کے اور لارڈ کرزن کے درمیان ہوا تھا، وہ خود اپنی مرضی سے تنہا ملاقات کے لئے آئے تھے۔ ان پر وقت

کیونکہ جواب دینے کے لئے کوئی زور نہیں ڈالا گیا تہا، بلکہ انہوں نے خود ایسا کرنا پسند کیا حالانکہ لارڈ کرزن برابر یہ مشورہ دیتے رہے کہ وہ پورے غور و خوض کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں، اس ملاقات کے بعد بھی ان کو ساڑھے تین مہینہ کا وقفہ مل گیا، جو ان کی بے ضابطہ منظوری کی باضابطہ تصدیق سے پہلے گذرا تھا۔ انہوں نے یہ باضابطہ تصدیق ایسے الفاظ میں کی جو مجبوری کے خیال کو تقویت دینے کے بجائے اعلیٰ درجہ کی طمانیت کو ظاہر کرتے ہیں اس کے بعد ان کو پہر تین مہینہ سے زیادہ کی مہلت عہدنامہ پر دستخط ہونے سے پہلے مزید غور کے لئے مل گئی، اور آخر میں خود ان کی اپنی یادداشت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاملہ کی اصلی صورت کے متعلق کسی غلط فہمی میں نہ تھے۔"

اس سے لارڈ ریڈنگ نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ۱۹۰۲ء کا عہدنامہ کسی دہوکہ اور فریب کے اثر سے نہیں کیا گیا تھا، بلکہ خوب سوچ سمجھ کر فرمانروائے وقت نے اپنی مرضی سے کیا تہا۔ لیکن اگر اسے مان بھی لیا جائے کہ اعلیحضرت میر محبوب علیخاں مرحوم کو سوچنے سمجھنے کا خوب موقع دیا گیا تہا اور وہ بحث کے لئے خوب طیار بھی تھے، اور انہوں نے آخری جواب دینے میں خود ہی جلدی بھی کی تھی، تب بھی نفس مسئلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اصلی سوال یہ ہے کہ جب وائسرائے نے اُن سے صاف طور پر یہ کہدیا تہا کہ سابق معاہدات کی رو سے ان کو استرداد برار کا کوئی حق نہیں ہے۔ برار کی تفویض عارضی بلکہ دوامی ہے، اور برٹش گورنمنٹ یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ برار کو نہ اسوقت اور نہ آئیندہ کبھی واپس دے گی، تو ایسی حالت میں اعلیٰ حضرت کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی گنجائش ہی کونسی باقی رہگئی تھی لارڈ کرزن نے

تو وائسرایانہ تحکم کے ساتھ استرداد کا دروازہ بند کرنے کے بعد اُنکے لئے صرف دو راستے باقی چھوڑے تھے، ایک یہ کہ ۲۵ لاکھ سالانہ کے عوض دوامی پٹہ لکھدیں، دوسرے یہ کہ موجودالوقت صورت کو برقرار رکھیں جس میں ان کو برار کی آمدنی میں سے ایک پیسہ بھی ملنے کی توقع نہ تھی، وائسرائے نے کہا تھا کہ وہ انہی دونوں صورتوں میں سے ایک کو اختیار کر سکتے ہیں، اور تیسری صورت یعنی استرداد کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ایسی حالت میں اگر اُن کو سوچنے اور سمجھنے کی مہلت بھی دی گئی تو وہ بے معنی تھی۔ لارڈ کرزن پر ہمارا اعتراض یہ نہیں ہے کہ انہوں نے اعلیحضرت کو سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں دی، بلکہ اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے عارضی اور معینہ تفویض کو دوامی اور مطلق قرار دیا، اگر ہمارا یہ اعتراض صحیح ہے تو ماننا پڑے گا کہ ۱۹۰۲ء کا معاہدہ غلط اثر کے ماتحت ہوا۔ اور اگر یہ اعتراض مسلم نہیں ہے، تو بتایا جائے کہ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۶۰ء کے عہدناموں اور اُن کے متعلق سرکاری اعلانات کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اس معاملہ میں یہی ایک بنیادی سوال ہے اور اسی سے لارڈ ریڈنگ نے گریز کیا ہے۔

اس طرح لارڈ ریڈنگ نے اصول کو چھوڑ کر تمام تر غیر متعلق اور فروعی باتوں تک اپنے جواب کو محدود رکھا اور آخر میں لکھا کہ

"یور اکزالٹڈ ہائی نس کا خط اس کے لواحق سمیت، میں نے یہ سمجھکر کہ یہی آپ کی خواہش تھی، ہز مجسٹی کے سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجدیا تھا، چنانچہ وہ بھی ان تمام نتائج سے متفق ہیں جن تک حکومت ہند پہنچی ہے، لہذا یہ فیصلہ جسے میں آپ تک پہنچانے کی عزت حاصل کر رہا ہوں، ہز مجسٹی کی حکومت کا فیصلہ ہے۔"

اگر لارڈ ریڈنگ کا جواب صرف بحث کی حیثیت رکھتا، تو چنداں قباحت نہ تھی، مگر بدقسمتی سے انہوں نے ایک طرف دعاوی کی تردید میں ناکافی اور بودے دلائل پیش کئے اور بنیادی مسائل پر بحث کرنے سے اعراض کیا، اور دوسری طرف اپنے اس جواب کو "فیصلہ" کے رنگ میں لکھا اور نہ صرف اسپرٹ سے، بلکہ الفاظ سے بھی یہ ظاہر کیا کہ یہ "فیصلہ" قطعی ہے۔ یہ غیر معقول پوزیشن کسی طرح قابل اطمینان نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخان بہادر نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۵ء کو ایک اور خط لکھا جس میں ان کے تمام دلائل کا جواب دیتے ہوئے اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی کہ ایسے مسائل میں جو دو حلیف طاقتوں کے درمیان متنازع فیہ ہوں کسی ایک فریق کو آخری فیصلہ کرنیکا کہاں تک حق حاصل ہے؟ اس کے متعلق حضور ممدوح نے لکھا:-

"حکومت برطانیہ کے ساتھ میرے تعلقات، نظام اور اپنی مملکت کا فرمانروا ہونے کی حیثیت سے اس باہمی دوستانہ اتحاد کے تابع ہیں جو میرے اسلاف اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان باہمی احترام، دوستی اور اشتراک مصالح کی بنیاد پر ہوا تھا۔۔۔۔۔۔ باستثناء ان مسائل کے جو خارجی طاقتوں اور خارجی سیاست سے تعلق رکھتے ہیں حیدرآباد کے نظام اپنی ریاست کے داخلی امور میں ویسے ہی خودمختار رہے ہیں جیسی برٹش گورنمنٹ برٹش انڈیا میں ہے، اس استثناء کے ساتھ جسکا ذکر میں نے کیا ہے، فریقین نے ہمیشہ ان بین الحکومتی مسائل میں جو قدرتی طور پر وقتاً فوقتاً ہمسایوں کے درمیان اٹھ کھڑے ہوا کرتے ہیں، کامل آزادی اور خودمختاری کے ساتھ عمل کیا ہے۔ اب مسئلہ برار اس استثنا

میں نہیں آتا اور نہیں آسکتا، کوئی خارجی طاقت یا پالیسی اس قضیہ میں متعلق یا مخل نہیں ہے، پس یہ قضیہ دو ایسی حکومتوں کے درمیان متنازع فیہ رہجاتا ہے، جو ایک ہی درجہ کی ہیں اور جن میں سے کوئی کسی کی تابع نہیں ہے، میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس درجہ کے دو فریق ایک دوسرے کے دعاوی اور تجاویز کو رد کر دینے کی آزادی ضرور رکھتے ہیں، مگر برٹش گورنمنٹ کا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے میں یہ پوچھنے سے احتراز نہیں کر سکتا کہ مسئلہ برار میں لفظ "فیصلہ" کا استعمال کہانتک صحیح ہے، خارجی امور کو الگ کرکے، میں برٹش گورنمنٹ کے ایک حلیف کی حیثیت سے اپنے لئے یہ حق محفوظ رکھنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ ہز میجسٹی کی حکومت کے اس انکار کو محض ایک "انکار" سمجھوں نہ کہ "فیصلہ" ...... میرے مطالبہ استرداد برار کے جواب میں ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کا انکار محض اس کی رائے کا اظہار تو ہوسکتا ہے، مگر وہ مجھپر اور میرے خاندان پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کر سکتا کہ اب اس قضیہ کو ختم شدہ اور اپنے دعوے کو ہمیشہ کے لئے خارج شدہ سمجھ لیا جائے، اس قسم کی پابندیاں ایسے حلفا پر کبھی حاوی نہیں ہوسکتیں جو اپنے عہدناموں کی شرائط کے ماتحت اس کی پوری آزادی رکھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی تجاویز سے اتفاق کریں یا نہ کریں"

آگے چلکر اعلیحضرت نے لارڈ ریڈنگ کے ایک اور غلط طرز تعبیر پر اعتراض فرمایا ہے۔ لارڈ ریڈنگ نے قضیہ برار کو ایک ایسا قضیہ قرار دیا تھا جس کا فیصلہ پہلے ہوچکا ہے، اسکے متعلق اعلی حضرت فرماتے ہیں:۔

"اس لفظ (یعنی فیصلہ) کا استعمال ایک دوسری قانونی اصطلاح "امرِ فیصل شدہ" (res judicata) کے ساتھ، مجھے پھر مجبور کرتا ہے کہ مسئلہ برار میں فریقین کی اعتباری حیثیت کے متعلق اپنے تصور پر مزید زور دوں۔ ....
.... یور اکسلنسی یقیناً جانتے ہونگے کہ میرے اسلاف یکے بعد دیگرے (برار کی دوامی تفویض کی) تجاویز کور و کرتے رہے ہیں، اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد ہز میجسٹی کی گورنمنٹ "امرِ فیصل شدہ" کا تصور کئے بغیر انہی تجاویز کو پیش کرتی، اور ان پر اصرار کرتی رہی ہے جسطرح اسوقت اس اصطلاح کا اطلاق درست نہیں تھا، اسی طرح اب بھی جب کہ میں اس مسئلہ کے از سرِ نو افتتاح اور اس کے واجبی اور مناسب تفحص کی درخواست کر رہا ہوں، اس کا اطلاق درست نہیں ہے، حلیفوں اور دوستوں کے درمیان اس قسم کے معاملات میں "امرِ فیصل شدہ" کا عذر کر کے تفتیش اور تجدید تجاویز کا سدِ باب نہیں کیا جا سکتا، اور نہیں کیا جانا چاہیئے۔ یہ قاعدہ تو مقننوں نے بالکل دوسرے ہی ظروف و احوال کے لئے وضع کیا تھا، جو ایسے فریقین اور ایسے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں جو نہ تو ہز میجسٹی کی گورنمنٹ اور نظام سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں اور نہ زیرِ بحث مسئلہ سے کوئی مجانست۔"

اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے اس سوال پر بحث کی ہے کہ فریقین میں سے کسی ایک کا جج بنجانا، اور محض انکار کی صورت میں بلا دلیل آخری و قطعی فیصلہ صادر کر دینا کہاں تک جائز ہو سکتا ہے؟ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ۔

"قطع نظر اس کے جو میں اوپر لفظ "فیصلہ" کے استعمال اور قضیہ برار پر قاعدہ

امر فیصل شدہ" کے اطلاق کے متعلق کہہ آیا ہوں، ایک اور بے ضابطگی بھی ہے جسکو نوٹس میں لائے بغیر چھوڑ دینا ناممکن ہے، سوال یہ ہے کہ جب کوئی نزاع دو ایسے حلیفوں کے درمیان پیدا ہو، جو ایک خاص امر تصفیہ طلب میں ایک دوسرے کی نسبت تابعیت کی پوزیشن نہ رکھتے ہوں، تو کیا آخری فیصلہ محض رد و انکار کی صورت میں صادر کرنے کا حق کسی ایک کے لئے محفوظ رہنا چاہیئے؟ اس قسم کا ضابطہ عمل تو یہ معنی رکھتا ہے کہ فریقین میں سے ایک جج بھی بنجائے، کسی امر متنازع فیہ میں اس طریقہ سے اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہوسکتا، جج اور فریق مقدمہ کا ذات واحد میں اجتماع، ایک ایسا انتظام ہے جو بہت کچھ قابل طلب چھوڑ دیتا ہے۔ ایک نامور قانون داں اور انگلستان کے سابق چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے یورایکسلنسی مجھ سے زیادہ اس کی اہلیت رکھتے ہیں کہ ایسے اجتماع سے تبرّی کریں"۔

اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے لارڈ ریڈنگ کے تمام دلائل کا لفظ بلفظ جواب دیا تھا، اور آخر میں اپنی طرف سے تصفیہ کی یہ صورت پیش کی تھی کہ:۔

"تصفیہ برار کے متعلق امور متنازع فیہ کو ایک کمیشن کے سپرد کر دیا جائے تاکہ وہ اس کی تحقیقات کرکے رپورٹ پیش کرے، اس کا صدر ایک بلند پایہ اور

سلہ میں نے اس فقرہ کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی ہے، مگر اصل انگریزی میں جو لطف ہے اسے اردو میں منتقل کرنا مشکل ہے۔ دیکھئے کسقدر خوب لکھا ہے۔

Judge and party in one is an arrangement that leaves much to be desired.

اعلیٰ قانونی تجربہ رکھنے والا برطانی جنٹلمین ہو جسے وزیر ہند نامزد کریں، اور صدر کے علاوہ اس کے چھ ارکان ہوں ان چھ میں سے دو حکومت ہند کے نامزد کئے ہوئے ہوں، دو میرے منتخب کئے ہوئے ہوں، اور دو خود اہل برار کے نمایندے ہوں جنھیں صوبہ متوسط کی کونسل، لیجسلیٹیو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے غیر سرکاری براری ارکان منتخب کریں۔ اس طرح مرتب کئے ہوئے کمیشن کے لئے متعین مگر وسیع حدود بحث و تفتیش مقرر کئے جائیں، تاکہ وہ ان تمام مسائل کی مکمل تحقیقات کرے جنہیں بدقسمتی سے ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور میرے درمیان اختلاف رائے ہے ان حدود کی تعیین اس طرح ہوسکتی ہے کہ حکومت ہند کے شعبہ سیاسیات کا ایک افسر اور میرا ایک آدمی یہ دونوں ملکر بحث کرلیں اور اس کے بعد میں اور ریورانسی امور تنقیح طلب کو باتفاق رائے طے کرلیں۔

اس کمیشن کا پورا خرچ میری حکومت برداشت کرے گی۔"

میں نے اس خط کے خاص خاص حصوں کو خود اعلیحضرت کے الفاظ میں نقل کیا ہے۔ تاکہ ہر شخص اسکو پڑھکر اس کی معقولیت کا خود اندازہ کرے اعلیٰ حضرت نے حکومت ہند کی اختیار کی ہوئی غلط پوزیشن پر جو اعتراضات کئے تھے انہیں کوئی منصف مزاج اور معقول آدمی ناروا اور بیجا نہیں کہہ سکتا، اور امور متنازعہ فیہ کے تصفیہ کی جو صورت حضور ممدوح نے پیش کی تھی وہ بھی نہ صرف معقول و مناسب بلکہ اعلیحضرت کی بہ نسبت خود حکومت ہند کے حق میں زیادہ مفید تھی، لیکن اس کا جو جواب حکومت ہند کے رئیس اعلیٰ نے دیا، اس کے متعلق اس سے بہتر کوئی اظہار رائے نہیں ہوسکتا کہ اسکو خود انہی کے الفاظ میں نقل کردیا جائے۔

لارڈ ریڈنگ اپنے ۲۷ر مارچ ۱۹۲۶ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

" میں یور اکزالٹڈ ہائی نس کی پیروی میں اس قضیہ کی تاریخی تفصیلات پر بحث نہیں کرنا چاہتا ، جیسا کہ میں آپ کو اپنے پہلے خط میں اطلاع دے چکا ہوں ، آپ کے پیش کردہ امور کی پوری توجہ کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی گئی ہے ، اور اب جو کچھ آپ فرماتے ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو میری گورنمنٹ اور وزیر ہند کے اخذ کردہ نتائج پر اثر انداز ہوئی ہو ....

" آپ نے بیان کیا ہے کہ حیدرآباد کے داخلی امور میں آپ فرمانروائے ریاست حیدرآباد ہونے کی حیثیت سے وہی درجہ رکھتے ہیں جو برٹش گورنمنٹ کو جہاں تک برطانی ہند کے داخلی امور کا تعلق ہے ، ہندوستان میں حاصل ہے ، .... یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یور اکزالٹڈ ہائی نس اپنے اور دولت عالیہ (Paramount power) کے تعلقات کے متعلق ایک غلط تصور رکھتے ہیں جسے دور کرنا ہز امپیریل مجسٹی کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھپر لازم ہے کیونکہ اسوقت ایک ایسے مسئلہ میں میری خاموشی کو ممکن ہے کہ بعد میں اس دعوے کے تسلیم کرلینے کا ہم معنی قرار دیا جائے ، جسے آپ نے پیش کیا ہے - تاج برطانیہ کی سیادت ہندوستان میں سب سے برتر ہے اور اس بنا پر کوئی والی ریاست برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ طریق پر گفت و شنید کرنے کا دعوی کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا - تاج کی برتری صرف معاہدات اور تہنا مجات ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اُن سے بے نیاز ہو کر بھی قائم ہے - خارجی دول اور سیاست سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اس کے خصوصی اختیارات سے قطع نظر ، برٹش گورنمنٹ

کا حق اور فرض ہے کہ بعزم و احتیاط ان تمام عہود و مواثیق کا احترام کرتے ہوئے جو ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں امن اور حسن انتظام کو برقرار رکھے، اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ اتنے معروف ہیں، اور دوسرے والیان ریاست کی طرح یور اکزالٹڈ ہائی پر بھی ان کا اطلاق اتنا روشن ہے کہ ان کو بیان کرنا مشکل ہی سے ضروری معلوم ہوتا ہے، تاہم اگر توضیح کی ضرورت ہو تو میں یور اکزالٹڈ ہائی نس کو یاد دلاؤنگا کہ ۱۸۶۲ء میں دوسرے والیان ریاست کی طرح فرمانروائے حیدرآباد کو بھی ایک سند دی گئی تھی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ان کے خاندان اور اُن کی حکومت کے بقا کی خواہشمند ہے، بشرطیکہ وہ تاج کے وفادار رہیں، اور یہ کہ مسند حیدرآباد پر کسی کی جانشینی اسوقت تک جائز نہ ہو گی جب تک ہز میجسٹی شہنشاہ معظم اس کو منظور نہ کرلیں، نیز جانشینی کے مسئلہ میں اگر کوئی نزاع برپا ہو تو برٹش گورنمنٹ تنہا اس کا فیصلہ کرے گی،،

" دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں برٹش گورنمنٹ کا حق مداخلت ان نتائج کی ایک دوسری مثال ہے جو برطانی تاج کی برتری کو لازمی طور پر متضمن ہیں۔ فی الواقع برٹش گورنمنٹ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ شدید وجوہ کے بغیر اس حق کو استعمال کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی، مگر وہ داخلی اور خارجی تحفظ جس سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں، انجام کار برٹش گورنمنٹ ہی کی محافظ قوت کے باعث انہیں حاصل ہے اور جہاں کہیں شاہی مفاد کا تعلق ہو، یا کسی ریاست کے طرز عمل سے اس کے باشندوں کی عام فلاح

وبہبود پر واقعی اور شدید مضرت رساں اثر پڑ رہا ہو، تو حسب ضرورت اسکا تدارک کرنے کی ذمہ داری آخر میں بالاتر قوت ہی عائد ہونی چاہیئے۔

اندرونی حاکمیت (Sovereignty) کے وہ تمام مدارج جن سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں، سب کے سب بالاتر قوت ہی کی جانب سے اس ذمہ داری کی مناسب انجام دہی کے ساتھ مقید ہیں، اسپر ایسی ہی دوسری مثالوں کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، جو مذکورۂ بالا مثالوں سے کچھ کم آپ کی اس رائے کی تغلیط نہیں کرتیں کہ باستثنائے امور متعلق بہ دول و سیاسیات خارجیہ، یور اکزالٹڈ ہائی نس کی حکومت اور برٹش گورنمنٹ ایک ہی درجہ مساوات پر قائم ہیں، مگر میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ یور اکزالٹڈ ہائی نس کو جو "یار وفادار" کا خطاب حاصل ہے اسکا یہ اثر نہیں ہے کہ تاج برطانیہ کی سیادت میں آپ کی گورنمنٹ کو دوسری ریاستوں سے کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔

"آپ نے حیدرآباد اور دولت عالیہ کے تعلقات کے متعلق اپنے موجودہ تصور کی توضیح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ جن نتائج پر پہنچی ہے ان کو لفظ "فیصلہ" سے تعبیر کرنے میں میں نے غلطی کی ہے، نیز یہ کہ قاعدہ "امر فیصل شدہ" کا اطلاق حیدرآباد اور حکومت ہند کے مابین نزاعی امور میں درست نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یور اکزالٹڈ ہائی نس کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرسکتا کہ آپ کے پیش کردہ امور کے متعلق وزیر ہند کے احکام ایک "فیصلہ" کی حد تک نہیں پہنچتے، یہ دولت عالیہ کا حق اور امتیازی حق ہے

کہ وہ تمام ان نزاعات کا فیصلہ کرے جو دو ریاستوں کے درمیان یا خود اس کے اور کسی ریاست کے درمیان پیدا ہوں، اگرچہ خاص خاص حالات میں ایک عدالت ثالثی بھی مقرر کی جاسکتی ہے مگر اس عدالت کا کام بھی صرف اتنا ہی ہے کہ حکومت ہند کو آزادانہ مشورہ دے، باقی رہا فیصلہ تو اس کا حق حکومت ہند ہی کو حاصل رہے گا۔"

"رہا اصطلاح "امر فیصل شدہ" کا استعمال تو یہ میں بھی جانتا ہوں کہ حکومت ہند کے لئے کسی عدالت دیوانی کی طرح اس کی ممانعت نہیں ہے کہ کسی ایسے مسئلہ کی سماعت کرے جو پہلے کسی فیصلہ کا موضوع بن چکا ہو، مگر "امر فیصل شدہ" کا قانونی اصول ٹھوس عملی ملحوظات کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کو جسکا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو بار بار انہیں فریقین کے درمیان زیر بحث لانا کسی طرح مرغوب نہیں ہے۔"

"اب میں آپ کی اس درخواست کی طرف توجہ کرتا ہوں کہ قبضۂ برار کی تحقیقات اور اسپر رپورٹ کرنے کے لئے کمیشن مقرر کیا جائے، یور اکز الٹڈ ہائی نس خود ہی جانتے ہیں کہ اب سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے حکومت ہند نے ایسے مسائل میں عدالت ثالثی مقرر کرنے کے لئے ایک خاص قاعدہ مقرر کیا ہے جنہیں کوئی ریاست حکومت ہند کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہو، لیکن اگر آپ اس تحریر کو ملاحظہ کریں گے جو اس جدید انتظام پر مشتمل ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی گئی ہے جس کی رو سے ایسے

مقدمات میں بھی عدالت ثالثی مقرر کی جاسکتی ہو جن میں خود ہز میجسٹی کی گورنمنٹ نے فیصلہ صادر کیا ہو، میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ایسا مقدمہ جیسا کہ یہ ہے، جس میں ایک پرانی نزاع کا خاتمہ ایک سمجھوتہ کے ذریعہ کیا جا چکا ہے، اور وہ سمجھوتہ بھی پورے غور و خوض کے بعد ایسی شرائط پر ہوا ہو جو ابہام سے پاک ہیں، ثالثی کی غرض سے پیش کرنے کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔"

میں نے چند غیر ضروری فقروں کو حذف کر کے یہ پورا خط لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے، تاکہ ہر شخص خود اس کو پڑھکر رائے قائم کر سکے، اس میں لارڈ ریڈنگ نے برابر کے اصلی مقدمہ کو اس کے تمام قانونی اور واقعاتی نکات سمیت نظر انداز کر کے صرف اس امر پر زور دیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بالادست ہے، اور دولت آصفیہ زیر دست، اس لئے اگر بالادست نے زیردست کا ملک جبر سے یا حیلہ سے یا کسیطرح چھین لیا، تو اب زیر دست کو یہ حق باقی نہیں رہا، کہ اس سے کسی دلیل و حجت کا مطالبہ کرے یا اپنے دعوئے استحقاق کو پیش کر کے اسپر بحث کرے، یا کسی عدالت ثالثی کے ذریعہ انصاف کرانے کی کوشش کرے بالادست کو حق ہے کہ بلا دلیل اپنی تائید میں خود فیصلہ صادر کر دے اور زیردست کا فرض ہے کہ خواہ وہ مطمئن ہو یا نہ ہو، بہر صورت اس فیصلہ کو سنکر دم بخود رہ جائے، لارڈ ریڈنگ نے دولت آصفیہ کو ایک ماتحت حکومت ثابت کرنے کے لئے جو طریق استدلال اختیار کیا ہے اسپر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اس کی کمزوری تو اسی سے ظاہر ہے کہ تمام معاہدات و تمسکات میں سوا اُن کو

صرف ایک ۱۸۶۲ء کی سند مل سکی ہے جسکو کھینچ تان کر بشکل یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ داخلی امور میں بھی دولت آصفیہ سلطنت برطانیہ کی تابع ہے حالانکہ ۱۸۰۰ء کا معاہدہ جسپر دولتین کے موجودہ تعلقات قائم ہیں، اسکی صاف تردید کر رہا ہے۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ دولت آصفیہ خارجی امور کی طرح داخلی امور میں بھی سلطنت برطانیہ کی تابع ہے، تب بھی یہ سوال جوں کا توں رہتا ہے کہ حقوق کے متعلق متنازعہ فیہ امور میں بالاتری وطاقتوری کی بنا پر "فیصلہ" صادر کرتا اور فیصلہ بھی اس طرح کہ بحث واستدلال کا دروازہ بند کرکے سادہ اور خالص رد وانکار کی شکل میں جواب دیدیا جائے، کہاں تک جائز، معقول اور اطمینان بخش ہوسکتا ہے، اس چیز کو خواہ کتنے ہی پیچ در پیچ اور وکیلانہ انداز بیان میں پیش کیا جائے۔ مگر کوئی صاحب عقل آدمی اتنی موٹی سی بات سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتا کہ حق اور انصاف کے معاملہ میں نہ بالادستی استحقاق کی دلیل ہوسکتی ہے، اور نہ زیردستی عدم استحقاق کی، اور خصوصیت کے ساتھ ایسا مقدمہ جس میں مدعی کی شکایات اتنی قوی، اتنی مدلل اور اتنی معقول ہوں، کبھی اسطرح طے نہیں ہوسکتا کہ بحث تفتیش، تحقیقات کچھ نہ ہو اور مدعٰی علیہ صرف یہ دوحرفی حکم صادر کردے کہ مدعی کا دعوی خارج، اگر بفرض محال یہ درست ہے کہ دولت آصفیہ حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں ایک تابعانہ حیثیت رکھتی ہے تب بھی اس کی تابعیت برطانی ہند کے رعایا سے زیادہ ادنی تو نہیں ہے، پھر جب برطانی رعایا کو حکومت کے خلاف علی القول

کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق ہے، اور انگریزی عدالتوں میں رات دن "تاج" (Crown) کے خلاف دعوے ہوتے رہتے ہیں، تو کیا سلطنت آصفیہ کا تاجدار برطانی رعایا کے معمولی افراد سے بھی گیا گذرا ہے کہ اس کو ایک آزاد اور غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ اپنی شکایات کے متعلق تحقیقات کرانے کا حق ہی نہیں مل سکتا؟ فصل خصومات اور تصفیہ نزاعات کا یہ تو کوئی بھی معقول طریقہ نہیں ہے کہ پہلے ملک پر عارضی قبضہ کیا جائے اس دلیل سے کہ اگر نہ دوگے تو پونا کی دو جمعیتیں تم پر حملہ کر دیں گی، پھر اس عارضی قبضہ پر دوامی تسلط کا پٹہ حاصل کیا جائے اس حجت سے کہ ملک تو تمہیں بہر صورت واپس نہ ملے گا، البتہ اگر تم دوامی پٹہ نہ لکھو گے تو اب تک اس میں سے جو تھوڑا بہت تمہیں ملتا رہا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا، پھر جب اصل حقدار اس ناجائز طریق ملک گیری پر اعتراض کر کے اپنے جائز دعاوی پیش کرے تو اس کو یہ کہکر خاموش کر دیا جائے کہ ہماری قوت تم سے بالاتر ہے، اور ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تمہارے ملک کو واپس نہ کریں گے اس لئے تم کو یہ فیصلہ بے چون وچرا تسلیم کرنا چاہیئے! یہ طریقہ برسر جنگ دشمنوں کیساتھ اختیار کیا جائے تو چنداں قابل تعجب نہیں، مگر دوستوں کے ساتھ اور دوست بھی وہ جو مصیبت کیوقت جان کی جگہ جان اور روپے کی جگہ روپیہ قربان کرنے میں دریغ نہ کرتے ہوں، اسے استعمال کرنا حق وانصاف ہی کا نہیں، بلکہ انسانیت وشرافت کا بھی خون کرنا ہے۔

سلطنت برطانیہ خود بھی اپنے اس جواب کی غیر معقولیت کو سمجھتی ہے، اور اُسے

معلوم ہے کہ اعلیحضرت میر عثمان علیخان جیسے مضبوط اور بیدار مغز فرمانروا کو ایسے جوابات سے خاموش کرنا مشکل ہے اس لئے اس نے ان کے دعوے کو رد کرنے کیساتھ ہی انہیں خاموش کرنیکا بالواسطہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ اعلیٰ حضرت کے لئے خود ان کے ملک میں داخلی مشکلات پیدا کرنی شروع کر دیں، وہی دولت آصفیہ جو اکتوبر ۱۹۲۳ء سے پہلے تک تمام نقائص سے مبرا تھی، اور جسے نومبر ۱۹۲۳ء میں خود لارڈ ریڈنگ نے یہ سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا کہ اسکا نظم ونسق نہایت عمدہ اور قابل اطمینان ہے، استرداد برار کا مطالبہ کرتے ہی اس میں ہزاروں عیوب نکلنے شروع ہو گئے، اس کی رعایا سے اس کے جاگیرداروں سے، اس کے امراو اعیان سلطنت سے اس کی پائیگاہوں سے غرض اس کی رعیت کے تمام طبقوں سے، برٹش گورنمنٹ کو گہری ہمدردی پیدا ہو گئی، اس کے فرمانروا کے انتظامی معاملات ہی نہیں بلکہ ذاتی معاملات تک نکتہ چینی و حرف گیری کے قابل ہو گئے، اور اس امر کی شدید ضرورت پیش آگئی کہ دولت عالیہ اس کے داخلی امور کی اصلاح کے لئے مداخلت کرے۔ استرداد برار کا مطالبہ کرنے سے پہلے تک ان خرابیوں میں سے کوئی خرابی وہاں نہ تھی اور اصلاح امور کے لئے مداخلت کرنا بھی برٹش گورنمنٹ کے فرائض سے خارج تھا، لیکن یہ مطالبہ کچھ ایسا منحوس نکلا کہ اعلیحضرت میر عثمان علی خاں کی زبان سے اس کے نکلتے ہی دفعتہً ہزاروں خرابیوں اور سیکڑوں عیوب کا دروازہ کھل گیا، اور بیچاری حکومت برطانیہ پر اس مطالبہ کو رد کرنے کے ساتھ ہی بیسیوں ایسے فرائض کا بار آن پڑا جن سے وہ پہلے بالکل سبکدوش تھی! یہ ڈھنگ ہیں جن سے حق طلبوں کا منہ بند کیا جاتا ہے اور بالادست بنگر زیردستوں سے اپنے فیصلے منوائے جاتے ہیں۔

ڈیڑھ صدی کے تعلقات پر ایک نظر

انگریزی حکومت کیساتھ فرمانروایان سلطنتِ آصفیہ کے ابتدائی تعلق سے لیکر جدید ترین عہد تک ڈیڑھ صدی سے زائد مدت میں دونوں سلطنتوں کے سیاسی تعلقات کا جو حال رہا ہے، اس کو خود انگریزی ذرائع اور زیادہ تر معتبر و مستند سرکاری ریکارڈ کے حوالہ سے ان صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے، اس طویل تاریخی داستان کی تفصیلات کو نظرانداز کر کے اگر اُسکا ایک اجمالی خلاصہ نکالا جائے، تو وہ ایک جملہ میں اسطرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ:۔

"دولت آصفیہ کی جانب سے ہمیشہ وفاداری اور احسان کا برتاؤ کیا گیا اور دولت برطانیہ کی جانب سے اس کا جواب ہمیشہ بیوفائی و محسن کشی کی شکل میں دیا گیا"

۱۷۶۶ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک دونوں کے سیاسی تعلقات کی پوری تاریخ کو پڑھ جائیے، آپ دیکھیں گے کہ سلطنت برطانیہ پر کوئی نازک وقت ایسا نہیں آیا ہے، جسمیں دولت آصفیہ نے جان و مال سے اس کی مدد نہ کی ہو، مگر اس کے ساتھ ہی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دولت آصفیہ کے احسانات کا بدلہ اس کو نقصان پہنچا کر نہ دیا گیا ہو. نواب میر نظام علیخاں نے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور اپنی مملکت کی پانچ شمالی سرکاریں اور کڑپہ اور بلاری کے علاقے ان کی نذر کئے. مگر اسکا بدلہ

یہ ملا کہ ان کی فوج کے بہترین حصہ کو زبردستی منتشر کیا گیا، اور مرہٹوں کے ہاتھوں اُن کی سلطنت کو پامال ہوتے دیکھکر انگریزوں نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ اس کے بعد نواب سکندر جاہ نے پہلی اور دوسری جنگ مرہٹہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا، اور انگریزوں نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ اُن کو خود ان کی مملکت میں بے بس کر دیا، اور اُن کے ملازموں سے ساز باز کر کے اُن کی مملکت کے لئے ہلاکت و بربادی کے تمام سامان مہیا کر دیئے۔ نواب ناصر الدولہ نے خود اپنے بھائی مبارز الدولہ کو جبکہ ان پر وہابی سازش کا الزام لگایا گیا تھا، قید کیا، ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۶ء اور ۱۸۳۹ء میں کرنول اور گومسور وغیرہ کے خلاف فوجی امداد دی، اور انگریزی حکومت کے ناجائز مطالبات پر بے چون وچرا لاکھوں روپیہ کنٹنجنٹ کے لئے دیا، مگر اس سلوک کے عوض فوجی دھمکی دیکر اُن سے اُن کی پوری ریاست کا تیسرا حصہ زبردستی حاصل کر لیا گیا۔ نواب افضل الدولہ اور اُن کے وزیر سالار جنگ نے غدر کے ہنگامہ میں انگریزوں کی ایسی اعانت کی جسپر خود وزیر ہند نے اُن کو وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھنے کا حکم دیا تھا، لیکن اس وفاداری کی یہ قدر کی گئی کہ استرداد برار کے لئے اُن کے جائز مطالبات کو پیہم ٹھکرایا گیا، اور آخر میں سالار جنگ کو گرفتاری تک کی دھمکی دیکر زبردستی خاموش کیا گیا۔ نواب میر محبوب علیخاں مرحوم نے مصر و افغانستان اور روس کے خلاف مالی اور فوجی امداد پیش کی اور تمام عمر انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے رہے،

مگر اُن کو اس کا یہ انعام دیا گیا کہ جب وہ شدید مالی مشکلات میں مبتلا تھے تو اُن کو برار کے منافع سے محروم کر کے اور معاہدات و مواعید کے خلاف استرداد برار سے مایوس کر کے اُن سے برار کا دوامی پٹہ حاصل کیا گیا۔ آخر میں اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر نے جنگ عظیم میں برطانی سلطنت کے تمام غیر برطانی دوستوں سے زیادہ اس کی مالی اور فوجی اعانت کی اور موت و زیست کی کشمکش میں اس کا ہاتھ بٹایا، مگر جب وہ سخت وقت گذر گیا تو ان کے احسانات کا بدلہ یہ دیا گیا کہ برار کے مسئلہ میں ان کے مطالبات کو سختی کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا، اور حق طلبی کی پاداش میں ان کے لئے طرح طرح کی داخلی مشکلات پیدا کرنے کا سامان کیا گیا۔

اس ایک طرفہ دوستی کی داستان پر اُس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو آج سے بہت عرصہ پہلے خود ایک اینگلو انڈین اخبار "ٹائمز آف انڈیا" کر چکا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"نظام دکن کیسا تھ ہمارے تعلقات اس زمانہ سے جبکہ ہم نے ایک محافظ قوت کی حیثیت اختیار کی، موجودہ اور زیادہ روشن زمانہ تک، ایسے رہے ہیں کہ ان کی تاریخ ہر اس شخص کو جو ہماری قومی سیرت، اور دیسی دماغ پر اس کے اثر کو خوب تر دیکھنے کا حریص ہو، رنج و افسوس کے ساتھ پڑھنی چاہئے۔ ہمنے ظاہر تو یہ کیا کہ نظام کے مقبوضات کو خارجی دست برد اور داخلی انتشار سے بچائیں گے، اُن کی سلامتی کے ضامن رہیں گے، اور اُن کی حالت کو

درست کریں گے۔ مگر ہم نے کیا یہ کہ اُن کی سلطنت کے صوبے پر صوبے ہضم کرتے چلے گئے۔ درحقیقت ہم نے نظام کو مجبور کرکے اسی ملک کے اقطاع اُن سے جبراً حاصل کئے، جس کی حفاظت کی ذمہ داری لیکر ہم اس کا معاوضہ بھی وصول کرچکے تھے، حیدرآباد کے لئے ہماری حمایت بجائے اس کے کہ تحفظ کی ضامن ہوتی، الٹی قطع و برید اور دست برد کا ذریعہ بن گئی، ایسی حالت میں اس کو حمایت سے موسوم کرنا اس لفظ کا بے محل استعمال ہے ایک سلطنت کا دوسری سلطنت کو اپنی حفاظت میں لینا، اور پھر اس حفاظت کے معاوضہ میں اس کے بڑے بڑے اقطاع کو یکے بعد دیگرے سلب کرتے رہنا، تا آنکہ وہ "محفوظ" سلطنت گھٹتے گھٹتے اپنی سابقہ عظمت وسطوت کا محض ایک شائبہ رہجائے، اور محافظ سلطنت اپنے مقبوضات میں اضافہ کرتی چلی جائے، ایک ایسی حرکت ہے جس کو لفظ حمایت وحفاظت سے تعبیر کرنا انتہا درجہ کی لغویت ہے، اگر یہ نتائج اس نوع کے سیاسی تعلق کے ساتھ ناگزیر ہیں تو ایسی حالت میں اس حمایت کو مفید سمجھنا تو درکنار، ہم کہیں گے کہ وہ کھلم کھلا دشمنی سے کچھ کم ہولناک نہیں ہے، اگر ہم نظام کو علانیہ جنگ میں شکست دیتے، اور فاتح کی حیثیت سے شرائط صلح پیش کرتے تو توسیع مملکت کے سلسلہ میں خواہ وہ کامل الحاق کی شکل میں ہوتی یا ارض مفتوح کے فوجی احتلال کی صورت میں ہکو شاید اس سے زیادہ ملک ہاتھ نہ آتا، جتنا ہم نے دوستی کے خوش آیند مظاہر اور پُر فریب حمایت وحفاظت کے پردہ میں حاصل کرلیا[1]!

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء

یہ تبصرہ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، جتنا کہ آج سے ۵۰ برس پہلے تھا۔

اس تاریخی داستان کو دہرانے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ جو کچھ زمانہ سابق میں ہوتا رہا ہے، وہی اب بھی ہوتا رہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ سابق میں جو غلطیاں کی گئی ہیں انہیں بیان کر کے اُن کے نتائج سے آگاہ کیا جائے اور ان کی تلافی کا مشورہ دیا جائے۔ تاریخ اس لئے نہیں ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے سبق حاصل کیا جائے، اگر کوئی قوم ڈیڑھ سو برس سے حماقتیں اور غلطیاں کر رہی ہو تو ان کے اعادہ کا یہ نتیجہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اسی ڈگر پر اور زیادہ اصرار کے ساتھ چلتی رہے۔ اگر درحقیقت یہ ثابت ہو جائے کہ اس کے وہ افعال غلط اور غیر معقول تھے، تو ہر خردمند انسان کے نزدیک اس کا نتیجہ صرف یہی ہونا چاہیے کہ آیندہ کے لئے وہ ان سے اجتناب کرے، جہاں تک ممکن ہو کھلے دل سے اُن کی تلافی کرے، اور عقل صحیح کی روشنی میں اپنے لئے ایک نئی اور زیادہ بہتر پالیسی اختیار کرے، اس طویل مضمون کی تحریر سے میرا مقصد بھی یہی ہے کہ سلطنت برطانیہ کے مدبرین کو یہ مشورہ دوں کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گذشتہ نامۂ اعمال پر ایمانداری کے ساتھ ایک نگاہ ڈال لیں، اور خود اپنے دل سے یہ سوال کریں کہ کیا دوستوں اور وفاداروں سے یہی سلوک کیا جانا چاہیئے؟ کیا کوئی قوم اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کر کے یہ امید کر سکتی ہے کہ کسی نازک وقت میں کوئی اس کی مدد کرے گا؟ کیا اس طرز عمل سے کوئی قوم اپنے دوستوں کی تعداد میں اضافہ اور دشمنوں کی تعداد میں تخفیف کر سکتی

ہے؟ اور کیا یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کے برتاؤ سے کوئی قوم دوسری قوموں کی وفاداری، اخلاص اور محبت کو خرید سکتی ہے؟ اگر اہل برطانیہ کی عقل کا اس حد تک دیوالہ نکل چکا ہے کہ ان سوالات کا جواب اثبات میں دے، تو وہ شوق سے اسی ٹیڑھے راستے پر چلتے رہیں جیسے چلتے رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھنے کے لئے تیار رہیں جو ایسی حرکات کا قدرتی نتیجہ ہے، لیکن اگر برطانی قوم میں فی الواقع کچھ ایسے صحیح الفکر ارباب نظر موجود ہیں جو اپنی سلطنت کی غلط پالیسی کے نتائج سمجھ سکتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ اس پالیسی پر نظر ثانی کریں، اور اپنے دوستوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو انعام واکرام نہیں حق وانصاف سے جوڑ کر، اس وفاداری کا اپنے آپ کو جائز مستحق بنائیں، جو ان کے لئے بڑے بڑے نازک اوقات میں حد درجہ قیمتی ثابت ہوئی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ گراں قدر تالیف دولت آصفیہ،
اور حکومت برطانیہ کے سیاسی تعلقات اور موخرالذکر کی دکن کے متعلق
پالیسی پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ دولت آصفیہ کیساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنے
والوں کی توسیع معلومات کے لئے میں نے اس کی اشاعت ضروری
سمجھی۔ امید کہ تاریخی دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے مطالعہ مستفید
اور محظوظ ہوں گے۔

خاکسار

حفیظ الرحمن خلف مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب

کوچہ چیلاں دہلی